رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۶۰ عدد ۲ — مئی ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	مئی ۱۹۶۳ء	جلد ۶۰

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ

لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

اگر آپ کو کبھی لاہور میں انارکلی یا اُس کے قرب و جوار سے گزرنے کا اتفاق ہُوا ہو تو آپ کی نگاہوں کے سامنے وہ سادہ سا دیہاتی ضرور گزرا ہو گا جو ایک سائیکل پر سوار ہو کر بڑے ہی پُرسوز انداز میں لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ شور و شغب کے اُس ماحول میں جب کہ ہر شخص کاروبار کی گہما گہمیوں میں پوری طرح گم ہوتا ہے، اُس کی ترغیب و ترہیب بڑی عجیب و غریب دکھائی دیتی ہے۔ کچھ لوگ اس کا نوٹس لینا ہی اپنی شان سے فروتر سمجھتے ہیں، کچھ اُس کی سادگی پر پھبتیاں کستے ہوتے قریب سے گزر جاتے ہیں، کچھ قیامت کا تذکرہ سُن کر چند طنزیہ فقرے چست کر کے اُس کی طرف سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ مگر وہ شخص اپنی بات پوری یکسوئی اور دردمندی کے ساتھ، دیکھنے والے اور سننے والوں کے طرزِ عمل سے بالکل بے پروا ہو کر کہے جاتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ مانگتا نہیں، کسی کی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔ بس لوگوں کو آخرت اور اُس کے انجام سے ڈراتا ہے۔

اس شخص کا طرزِ تبلیغ کس حد تک نتیجہ خیز ہے، اس چیز سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ لیکن اُسے دیکھ کر ایک محدود پیمانہ پر ہی سہی انسان کے سامنے وہ منظر ضرور آ جاتا ہے جو دنیا کی لذتوں میں کھوئی ہوئی مخلوق داعیانِ حق کے مقابلے میں پیش کرتی ہے۔ یُوں نظر آتا ہے کہ پوری دنیا ایک انارکلی ہے جس میں ہر فرد دنیاوی فوائد و لذائذ کے حصول کے لیے دیوانہ وار بھاگا جا رہا ہے۔ اُسے کام و دہن کی لذت کے علاوہ کوئی فکر نہیں، اچھے سے اچھے لباس اور بہتر سے بہتر سامانِ آرائش حاصل کرنے کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں۔ مال فروخت کرنے والے ہیں کہ حلال و حرام کے لطیف احساسات سے قریب قریب

عاری ہو کر دولت سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ وہ انسان نہیں بلکہ مشینیں ہیں جو صبح سے شام تک یہ جان سکے جمع کرنے میں مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ یہ دیکھیں کہ وہ جو مال لوگوں کو دے رہے ہیں اُس سے قوم کے اخلاق اور سیرت و کردار پر کیا اثر پڑے گا۔ انہیں بس ایک ہی دُھن لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح اُن کی تجوریاں جلد از جلد بھری جا سکیں۔

انارکلی کا جو منظر اوپر پیش کیا گیا ہے یہ کسی ایک مقام یا کسی خاص جگہ کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ مادّی تہذیب کا شارح اور ترجمان ہے۔ یہ خدا سے غافل لوگوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ مادہ پرستانہ ماحول کا ایک زندہ نمونہ ہے جس میں خدا کی طرف بلانے والوں اور عذابِ قیامت سے ڈرانے والوں کی آواز کو ہمیشہ وحشت اور دیوانگی کی آواز سمجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس روحانیت کُش اور اخلاق سوز ماحول میں مادّی لذات میں ڈوبے ہوئے انسانوں نے دعوت الی اللہ کے معاملے میں ہمیشہ اُسی بے رُخی اور عدمِ توجہی کا مظاہرہ کیا جو آج انارکلی کے اندر بیچارے "غریب" "دیہاتی" کی نحیف مگر دل ہلا دینے والی آواز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے ہر عہد میں جب بھی مادی تہذیب کا غلغلہ بلند ہوا تو خدا خوفی، تقویٰ، پرہیزگاری، حشر و نشر اور آخرت کی جواب دہی کی باتیں کرنے والوں نے معاشرے میں اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی اور بے بس پایا جتنا کہ یہ اللہ کا بندہ اپنے آپ کو پا رہا ہے۔ یہ بچارا تو ایک عام دردمند مسلمان ہے۔ ممکن ہے وہ حکمتِ تبلیغ کی نزاکتوں سے بھی واقف نہ ہو اس لیے ابلاغِ حق میں اُس سے کوتاہی ہو سکتی ہے۔ مادّی تہذیب کے پرستاروں کے قلب و دماغ میں تو اُن پاکباز لوگوں کی آواز بھی اثر و نفوذ نہ کر سکی جنہیں اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی نگرانی میں اس مقدس فرض کی انجام دہی کے لیے تربیت دی تھی۔ غفلت میں ڈوبے ہوئے ان دنیا داروں نے نہ صرف اُن کی دعوت سے اغماض برتا بلکہ خدا کے فرستادوں کا مذاق اڑایا، ان کی راہ میں روڑے اٹکائے، ان کی سرِ بازار تضحیک کی، ان کے خلاف طرح طرح کے الزامات تراشے، انہیں مختلف قسم کی اذیتیں پہنچائیں حتیٰ کہ ان کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں کے چراغ کو گل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ ان دنیا پرستوں کے افکار و نظریات اور حق کے معاملے میں اُن کی بے حسی اور سرد مہری بلکہ دشمنی اور بغاوت کے تذکرے ملتے ہیں۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور نیکی اور پرہیزگاری کی راہ پر چلنے کی دعوت دی تو اس بدنصیب قوم نے جس شرمناک طریق سے اس دعوت کو جھٹلایا وہ دنیا داروں کے نفسیات کی نہایت ہی صحیح عکاسی کرتا ہے

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ	ہم نے نُوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا
يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ	اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ	تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ مَیں تمہارے حق میں ایک
قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي	ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے
ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۔ (الاعراف - ۸)	سرداروں نے جواب دیا ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم
	صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور قوم کے سربراہوں کا اس دعوت سے اعراض حق و باطل کی آویزش کی نہایت اچھے انداز سے ترجمانی کرتا ہے اور اس سے دونوں کی مخصوص نفسیات کا بآسانی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف اخلاص اور صداقت ہے اور دوسری طرف غرور و استکبار۔ ایک طرف بے لوثی اور دردمندی ہے اور دوسری طرف مفادات کی پرستش اور نخوت۔ ایک طرف کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو تسلیم کرنے کی مخلصانہ پیش کش ہے اور دوسری طرف اس بنیادی حقیقت، جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہے، کو ردّ کرنے کے مختلف ڈھکوسلے۔ ایک طرف ایمان اور یقین کا پہاڑ ہے اور دوسری طرف مکر و فریب کا بیتِ عنکبوت۔

پھر اس آیت میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس قوم کو اخلاقی برائیوں نے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ وہ انحطاط کی اُس منزل پر پہنچ چکی تھی جس میں لوگ اپنی کج فہمی کی بنا پر باطل کو حق

اور حق کو باطل سمجھنے لگتے ہیں اور حق و صداقت کے داعیوں کو تعصب، تنگ نظری اور رجعت پسندی کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔

فکر و نظر کا یہ انقلاب اور احساس و جذبات کی یہ تبدیلی دفعتاً واقع نہیں ہوتی بلکہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں یہ سارے مراحل طے کیے جاتے ہیں۔ جب کوئی قوم حق کی سیدھی راہ چھوڑ کر گمراہی کی طرف بڑھتی ہے تو اس کے راستے کی پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ عوام کے دلوں میں نیک کام کرنے کی لگن اور برائی سے بچنے کی تڑپ ختم ہوتی ہے۔ پھر خیر و شر کے درمیان فطرت نے جو وسیع خلیج حائل کر رکھی ہے وہ آہستہ آہستہ پاٹتی ہے اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ لوگ منکرات کو گوارا کرنے لگتے ہیں

کسی فرد یا گروہ کا برائی کو برداشت کر لینا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کے دل میں نیکی سے محبت اور اس کے تسلط کے لیے عزم ختم ہو رہا ہے اور اس کے مقابلے میں برائی کے خلاف اس کے قلب و دماغ میں جو نفرت فی الواقع ہونی چاہیے وہ بھی آہستہ آہستہ گھٹتی جا رہی ہے۔ اسی وجہ سے خیر و شر کے اس زبردست ہنگامہ سے منہ موڑ کر وہ کسی گوشۂ عافیت میں پڑا اپنی زندگی کے ایام گزار رہا ہے۔ جس طرزِ عمل کو ایک انسان واقعی اپنے لیے، اپنے خاندان کے لیے، اپنی قوم کے لیے اور پوری نوعِ بشری کے لیے صحیح اور برحق سمجھتا ہے اور جس میں وہ دنیوی اور اخروی فلاح کا راز مضمر پاتا ہے اس کے بارے میں وہ کبھی بھی سرد مہری کا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرزِ عمل کو سب سے پہلے پوری یکسوئی کے ساتھ خود اپنانے کی کوشش کرے گا، پھر اسے دوسروں کو اختیار کرنے کی بڑے اخلاص اور دردمندی کے ساتھ دعوت دیگا۔ اس کے راستے میں جو موانع ہیں انہیں ہٹانے کی فکر کرے گا۔ اس کے دل میں اس طرزِ عمل کے ساتھ جتنی زیادہ لگن ہوگی اُسی نسبت سے اسے پھیلانے۔ اس کی برتری قائم کرنے کے لیے اُس کے اندر تڑپ بھی موجود رہے گی

اسی طرح اُس کا دل جس قول یا فعل کو فی الواقع منکر سمجھتا ہے اور جس کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں وہ اپنی اور نوعِ انسانی کی بربادی دیکھتا ہے، اُس کی ترقی کو وہ کبھی غیر متعلق تماشائی بن کر برداشت

نہیں کر سکتا۔ وہ اسے جتنی خطرناک برائی سمجھے گا اتنی ہی اُس کے دل میں اس کے خلاف عداوت اور نفرت ہوگی اور وہ اسے مٹانے کے لیے جدوجہد کرے گا۔

خیر و شر کی اس کشمکش میں جتنا کوئی شخص یا گروہ بے تعلق اور غیر جانبدار رہتا ہے اُسی تناسب سے اُس کے اندر ایمان کی حرارت کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ محض ایک راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے جسے فسق و فجور کی آندھیاں اور باطل کے جھکڑ جس طرف چاہتے ہیں اڑا کر لے جاتے ہیں۔ ایمان کا جو شعلہ منکرات کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا عزم اور ہمت نہیں رکھتا وہ کبھی دیر تک اپنی روشنی قائم نہیں رکھ سکتا۔

یہ صورتِ حال جس میں لوگ فسق و فجور کو عین اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھتے ہوئے دیکھیں لیکن ان کے اندر کوئی جھنجلاہٹ نہ پیدا ہو اور وہ اس کی سنگینی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی نیندیں حرام کرنے سے گریز کریں • [illegible] کے سیلاب کو روکنے کے لیے اپنے مفادات کو قربان کرنے پر اپنے آپ کو تیار نہ پائیں، کسی قوم کے لیے کوئی خوش کن بات نہیں۔ یہ ایک روگ ہے جو اُسے اندر ہی اندر کھا جاتا ہے۔ لیکن یہ مرض کی آخری منزل نہیں ہوتی۔ اس منزل میں لوگ بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں۔ وہ اگرچہ نیکی کو قائم کرنے اور برائی کو مٹانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ تو نہیں ہوتے لیکن اُن کے دل و دماغ نیکی کو بہر حال نیکی ہی سمجھتے ہیں اور برائی کو بُرائی کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔

اگر انحطاط کا یہ سلسلہ جاری رہے اور اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی جائے تو پھر یہ مرض شدید صورت اختیار کر لیتا ہے اور قوم اسی منزل پر پہنچ جاتی ہے جس پر کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پہنچ چکی تھی۔ یہ منزل نہیں ہوتی بلکہ کسی قوم کی تباہی و بربادی کا پیغام ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ مرض اس کے رگ و پے میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اور اس کے قلب و دماغ کا کوئی [illegible] ایسا باقی نہیں رہا جس میں اس کی جڑیں اچھی طرح [illegible]

چکی ہوں ۔

یہ وہ منزل ہے جس میں اخلاقی اور روحانی عوارض اُس کی زندگی کا جزو بن کر اُس کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو، اُس کے ضمیر و وجدان کو اور اُس کے احساسات و جذبات کو یکسر بدل دیتے ہیں قلب و دماغ کی اس تبدیلی کے بعد اُس کی زندگی کی ساری قدریں زیروزبر ہوجاتی ہیں۔ بُرائی بھلائی کا روپ دھار لیتی ہے۔ منکر معروف کا جامہ پہن کر معاشرے میں سرگرم عمل ہوتا ہے۔ نیکی اور شرافت کی جگہ چالاکی اور عیاری کی عزت و تکریم ہونے لگتی ہے۔ جزا و سزا، اور حشر و نشر کو لوگ محض اعتباری باتیں سمجھ کر نظر انداز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خدا خوفی اور فکرِ آخرت کو تنگ نظر اور تاریک خیال لوگوں کا بیکار مشغلہ قرار دے کر، اُسے بے وقعت بنایا جاتا ہے۔ کسی قادرِ مطلق ذات پر ایمان اور یقین اور اُس کے نازل کردہ احکام کی اتباع اور پیروی کو کم علموں کا شیوہ گردان کر لوگوں کو اسے ترک کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

قلب و نگاہ کی اس تبدیلی کے نتیجے میں معاشرے کے سارے ڈھانچے میں ردّو بدل ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی میں وہ لوگ جو فی الحقیقت پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک ہوتے ہیں، وہ بے وزن ہو کر رہ جاتے ہیں اور قیادت اور سیادت کا منصب اُن لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے جن کے اخلاق کا بالکل دیوالیہ نکل چکا ہو۔ وہ ہر عمل کو مادی نفع و نقصان کی کسوٹی پر پرکھ کر اُس کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نیکی اور بھلائی کے ... یہ معنی ہوتے ہیں کہ کسی طرح زر و مال کی زیادہ سے زیادہ مقدار میسر آسکے، معاشرے میں ان کی کبریائی کے ٹھاٹھ قائم ہوں۔ اُن کی زبان جس چیز کو حق کہہ دے اُسے معاشرہ حق کی حیثیت سے ہی بلا چون و چرا تسلیم کرے اور جس چیز کے خلاف اُن کی بارگاہ سے باطل کا فتویٰ صادر ہو جائے اُسے بادنیٰ تامل باطل قرار دے دیا جائے۔ ان گمراہ کُن لوگوں کی فطرت اس حد تک مسخ ہو جاتی ہے

اور ان کی جسارت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ اور مقدس تعلیم میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں اور انہیں خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اُس کے اپنانے سے اُن کی قوم کو نقصان پہنچے گا۔

ان لوگوں کو اپنی عقلی برتری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے اور وہ سارے معاملات کی قدر و قیمت کا اندازہ بزعمِ خود عقل کی میزان پر تول کر کرتے ہیں۔ لیکن وہ عقل جو اپنی حدود سے پوری طرح واقف نہ ہو اور جسے وحی اور الہام کے مقابلے میں اپنے مزعومات پر زیادہ اعتماد ہونے لگے اس عقل پر اگر اللہ کی پھٹکار نہیں پڑی تو اور کیا ہوا ہے۔ چنانچہ عقل کے ان اندھوں کو کوئی چیز بھی صحیح نظر نہیں آتی۔ معاشرے کے وہ لوگ جن کے دم قدم سے خیر اور بھلائی کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور شرافت کی اقدار دنیا میں پھلتی پھولتی ہیں وہ انہیں بے وقوف اور رذیل دکھائی دیتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ۔
(ہود ۲۷)

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اس نے کہا) میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک دردناک عذاب آئے گا۔ جواب میں اس کی قوم کے سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ بولے ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ کمین اور چھچھورے تھے ان کے سوا کسی نے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی نہیں کی۔ اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

جن لوگوں کی بدنصیبی اور کوتاہ بینی کا یہ عالم ہو کہ وہ معرفتِ الٰہی کے بیش بہا خزانے حاصل کرنے والوں کو تہی دامن قرار دیں اور انہیں کمینے اور چھچھورے کے نازیبا الفاظ سے مخاطب کریں، جنہیں فہم و فراست کے بلند بانگ دعووں کے باوجود خدا کے ان پاکباز بندوں کی اخلاقی اور روحانی برتری اور اُن کے اعلیٰ اور ارفع سیرت و کردار اور اپنی کم فہمی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے درمیان کوئی امتیاز نظر نہ آتا ہو، اُن کی طرف اگر انسانیت رشد و ہدایت کے لیے لپکے تو اُسے سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

اگر آپ خدا اور رسول کے ان دشمنوں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی مخالفت کی اصل وجہ یہ نہیں ہوتی کہ کائنات کی وہ بنیادی حقیقتیں جنہیں تسلیم کرنے کی انبیاء علیہم السلام دعوت دیتے ہیں وہ ان کے ذہن نشین نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کی مخاصمت کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ قیادت اور سیادت کا وہ منصب جو بڑی چالاکی اور عیاری سے اُن کے ہاتھ آتا ہے اس دعوت کے پھیلنے سے اُس کے چھن جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ انہیں ہر لمحہ یہ خوف محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب ہدایت کے طلوع ہو جانے کے بعد باطل کی تاریکیاں خود بخود چھٹ جائیں گی اور اندھیروں میں معاشرے کے اندر وہ جس قسم کی دراز دستیاں کرتے رہے ہیں اُن سب کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کے ان خدشات کو کئی موقعوں پر نقل کیا ہے۔ سورۃ "المومنون" میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے سلسلے میں اُن کے اسی خدشہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ	ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے۔ کیا تم ڈرتے نہیں ہو، اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے

اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ۔ سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر
(رکوع ۲) ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر
برتری حاصل کرے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مخالفت کا اصل محرک یہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر یہ دعوت محض نظری ہوتی اور اس کی ترقی سے اُن کی غلط قیادت پر کوئی ضرب کاری لگنے کا خطرہ نہ ہوتا، تو وہ کبھی بھی اس کی راہ میں اس طرح مزاحم نہ ہوتے جس طرح کہ وہ فی الواقع ہوتے تھے، لیکن وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ جس رفتار سے یہ دعوت پھیل رہی ہے اسی رفتار سے معاشرے کے اندر ان کی خدائی کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ خالقِ کائنات کی حاکمیت تسلیم کر لینے کے بعد کسی فرد یا گروہ کی کبریائی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اور یہی وہ اصل خطرہ ہے جس کے پیشِ نظر جھوٹے خداؤں نے دینِ حق کا ہمیشہ راستہ روکنے کی مذموم کوششیں کیں۔

پھر اسی ضمن میں ان دنیا پرستوں کی سیرت کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ ہر معاملہ کو جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اُن کی عقل کبھی یہ باور ہی نہیں کر سکتی کہ دنیا کا کوئی شخص یا گروہ بے لوث اور بے غرض بھی ہو سکتا ہے اور مادی فوائد سے بلند ہو کر کوئی مقدس فرض سرانجام دینے کی ہمت کر سکتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ "دین کی دعوت" بھی محض ایک کاروبار ہے جسے چند لوگ دنیاوی نفع کے لالچ میں چمکانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انبیاء علیہم السّلام کو بار بار ان کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو دُور کرنا پڑا اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانی پڑی کہ زر و مال دنیا پرستوں کے لیے تو بلاشبہ اپنے اندر غیر معمولی کشش رکھتا ہے اور اس ایک محرک کے علاوہ کوئی دوسرا محرک انہیں کسی کام کے لیے سرگرمِ عمل نہیں کر سکتا لیکن وہ لوگ جن کی نگاہیں دنیا کی اس عارضی اور خواب آسا زندگی کے بجائے آخرت کی پائیدار زندگی پر لگی ہوئی ہیں اُن کے اعمال کے محرکات مادی فوائد کے بجائے اخروی انعامات ہوتے ہیں۔ یہ مقدس لوگ اپنی خدمات کے صلے

کے لیے دنیا کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے بلکہ اپنے خالق اور مالک کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام نے بار بار یہی کہا کہ اُن کا اجر بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے باطل کے علمبرداروں کے خدشات کی تردید کرتے ہوئے بڑے بلیغانہ انداز میں فرمایا:

یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۔ (ہود۔ ۳)	اے قوم! میں تم سے مال و متاع کا مطالبہ نہیں کرتا میرا اجر تو اللہ کے ہاں ہی ہے

جب کسی معاشرہ پر باطل کے پرستاروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے تو پھر پورے معاشرے کا مزاج اس طرح بگڑتا ہے کہ اُس کے اندر نیک اور بھلے لوگ اجنبی بن جاتے ہیں اور ان کی جگہ شریر اور اخلاق باختہ لوگوں کی پذیرائی ہونے لگتی ہے۔ خدا ترس لوگ اُس معاشرے کے اندر ایک بوجھ کی حیثیت سے دیکھے جانے اور اُن کے اثرات کو زائل کرنے کے مختلف منصوبے تیار ہوتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے اسی احساس کو قرآن مجید نے مندرجہ ذیل الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکُمْ مَقَامِیْ وَتَذْکِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَعَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ ۔ (یونس۔ ۸)	اور اے پیغمبر ان کو نوح کا قصہ سناؤ۔ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: بھائیو اگر (تم میں) میرا رہنا اور خدا کی آیتیں سنانا تم کو گراں گزرتا ہے تو میں تو اپنے رب پر ہی تکیہ لگاتا ہوں۔

کسی معاشرے کی اس سے بڑی گراوٹ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حق اور صداقت کے داعیان تو اس پہ بوجھ محسوس ہوں اور باطل کے محافظ اور علمبردار اس کے نجات دہندہ خیال کیے جائیں۔

جب کوئی سوسائٹی کفر و الحاد کے دعویداروں کو فسق و فجور کی سرپرستی کرنے والوں کو نہ صرف قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے بلکہ انہیں معاشرے کے اندر عزت و احترام کا ایک بلند مقام عطا کر دے اور اُن کے مقابلے میں اُن حضرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے جن کے ذریعہ وہ

صحیح معنوں میں فوز و فلاح حاصل کر سکتی ہے تو پاگل پن اور دیوانگی کی اس کیفیت کے پیدا ہو جانے کے بعد پھر اُس سوسائٹی کو تباہی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے فضل و کرم سے اُس کے بچاؤ کے غیب سے کوئی خصوصی انتظامات فرمادے

اس آسمان کے نیچے جن قوموں اور معاشروں کے اندر بھی یہ اخلاقی اور روحانی برائیاں پروان چڑھیں انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ خدا کا قانون کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اُس کی سُنّت آج تک کبھی انسانوں کی کسی بھیڑ کے لیے نہیں بدلی۔ جس طرح آگ جلاتی ہے اور زہر کے کھانے سے انسان موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح خدا سے بغاوت اور سرکشی اور اس کے بتلائے ہوئے راستہ سے انحراف، ہلاکت لاتا ہے - اس باغیانہ طرزِ عمل سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا - بلکہ قوموں کو عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے، اب بھی ایسا ہی ہو رہا ہے اور جب تک قدرت کا یہ نظام قائم ہے اسی طرح ہوتا رہے گا۔

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا - (۳۳-۶۲)

یہ اللہ کا قانون ہے جس کے مطابق تم سے گزری ہوئی قوموں سے سلوک ہوا اور اللہ کے قانون میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

آپ قرآن مجید کے اوراق اُلٹیے تو آپ کو جگہ جگہ سرکش قوموں کی عبرتناک داستانیں بکھری ہوئی ملیں گی۔ دنیا میں بے شمار قومیں اس دھرتی کے سینہ پر اُبھریں، انہوں نے اپنے فہم و تدبر اور جوشِ عمل سے طاقت کو غلام بنایا اور پھر دنیا پر چھا گئیں لیکن جلد ہی قوت اور عظمت کے خمار نے اُن کے دماغی توازن کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ پھر انہوں نے خدا کی کبریائی کی دعوت دینے کے بجائے اپنی خدائی کا سکّہ چلانا شروع کیا۔ انسانوں کے درمیان شریف و کمین کی مصنوعی تفریق پیدا کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوت و طاقت جس کے بل بوتے پر انہوں نے دنیا میں اپنی سیادت اور برتری قائم

کی تھی وہ اُن کی جان لیوا ثابت ہوئی اور تاریخ کے وہ اوراق جن میں اُن کے کارنامے جلی حروف سے لکھے گئے تھے ان میں اُن کی حسرتناک بربادی کے مرثیے بھی درج ہوئے ۔

اَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۔ (التوبہ - ۹)

کیا انہوں نے ان لوگوں کا حال نہیں سنا جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں۔ مثلاً قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، اصحاب مدین اور وہ لوگ جن کی بستیاں الٹ دی گئیں۔ ان سب کے پاس اللہ کے رسول آئے اور راہِ حق کی نشانیاں انہیں دکھائیں لیکن انہوں نے بدعملیوں کی راہ اختیار کی اور ان کی پاداش میں مٹا دیئے گئے۔ سو اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا مگر ان بدبختوں نے خود ہی اپنی ہلاکت چاہی

اسی حقیقت کی طرف سورہ ابراہیم میں یوں توجہ دلائی گئی ہے :

اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ (۲)

کیا تمہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد میں آنے والے جنہیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا ہے۔ اُن کے پاس اُن کے پیغمبر نشانیاں لیکر آئے تو وہ غصے سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے اور کہنے لگے کہ تمہیں جس تعلیم کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے ہم اسے نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس پر ہمارے دل مطمئن نہیں ہو پاتے ۔

اس سے اگلی آیت میں استعجاب اور حسرت کے ملے جلے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے انہیں مخاطب کرکے پوچھا گیا ہے ۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	کیا تمہیں ارض و سما کے خالق اللہ کے بارے میں شک ہے۔

یعنی تمہارے دماغ اتنے ماؤف ہو چکے ہیں اور تمہاری عقلوں پر اس قدر پردے پڑ چکے ہیں کہ تمہارے اندر کائنات کی معروف، مسلّم اور بیّن حقیقت کے بارے میں بھی اشتباہ پیدا ہو رہا ہے۔ خدا کا وجود خود انسان کے اپنے وجود سے زیادہ واضح حقیقت ہے۔ خالق کی نشانیاں اس کائنات کے کونے کونے میں بکھری ہوئی ہیں اور اس کا ہر ذرہ اس کی حکمت بالغہ اور لازوال قوت و طاقت پر شہادت دے رہا ہے۔ تمہارا یہ انکار بھی اس وجہ سے نہیں کہ تمہیں حق کو پہچاننے میں کچھ دشواریاں پیش آ رہی ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ صرف ایک ہی ہے کہ تم نے اپنی بداعمالیوں سے اس جوہر نایاب کو ضائع کر دیا ہے جسے عقل سلیم اور وجدان کہا جاتا ہے۔ اب تمہاری حیثیت انسانوں کی نہیں بلکہ جانوروں کی سی ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے تم جانوروں سے بھی بدتر ہو۔ تمہاری آنکھوں میں بصارت تو ہے لیکن وہ بصیرت سے محروم ہو چکی ہیں۔ تمہارے کانوں میں قوت سماعت تو ہے لیکن اب وہ فطرت کی ان لطیف آوازوں کو سننے سے قاصر ہے جو افلاک سے آتی ہیں۔ تمہارے دل بس گوشت کے لوتھڑے ہیں جو تمہارے پہلوؤں میں ہر وقت ہلتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر کوئی احساس پیدا نہیں ہونے پاتا۔

لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا، وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا، اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ [illegible]	ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں، وہ مثل چارپایوں کے ہو گئے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر، اور یہی ہیں کہ غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔

جب کوئی قوم غفلت کی اس نچلی سطح پر آجاتی ہے کہ اس کے اندر سوچنے، سمجھنے اور غور سے

کی ساری صلاحیتیں ختم ہو جائیں اور اس کے احساسات کے رواں دواں دھارے بالکل خشک ہو کر رہ جائیں تو پھر اُسے دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بحیثیت انسان پیدا کیا ہے لیکن جب اُس کی انسانیت جس کی وجہ سے اُسے اشرف المخلوقات کا تاج پہنایا گیا ہے وہی ختم ہو جاتے تو پھر وہ دنیا کی پشت پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اور اس بنا پر قانونِ مکافات کے مطابق یہ سرزمین اُس کے وجود سے جلد ہی پاک کر دی جاتی ہے قرآن مجید نے بار بار اس حقیقت کی طرف غافل انسانوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ۔ (الانعام-۱)

کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی امتوں کو ہلاک کیا۔ ہم نے انہیں زمین میں وہ سربلندی اور سرفرازی عطا کی تھی جو تمہیں نہیں کی۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِئْيًا۔ (مریم-۵)

اور ہم نے اس سے پہلے کتنی امتوں کو تباہ کر دیا جو ان سے سامانِ زیست اور نمود و نمائش میں کہیں بڑھے ہوئے تھے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (الانبیاء-۲)

اور بہت سی بستیاں جہاں کے لوگ سرکش تھے انہیں ہم نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسرے لوگ پیدا کئے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا۔ (القصص-۳۰)

اور کتنی بستیاں جو اپنی معاش پر اترا رہی تھیں انہیں ہم نے ہلاک کر کے رکھ دیا اور اُن کے اُجڑے ہوئے گھر پھر آباد نہیں ہوئے۔

آج ہمیں سوچنا ہے کہ کہیں ہم بھی اپنے اعمال و افعال سے خدا کے عذاب کو انگیخت تو نہیں کر رہے۔ بغاوت اور سرکشی کی وہ کونسی سرحد ہے جس کو ہم نے پار کرنے کی جسارت نہیں کی۔ اللہ کے دین کے ساتھ ہم بالکل مذاق کرتے ہیں۔ اسے زبان کی حد تک ہدایت اور رہنمائی کا واحد سرچشمہ تسلیم

کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں سے اسے خارج کرتے چلے جارہے ہیں۔ ہماری سیاست، ہماری معیشت اور ہماری معاشرت سے اس کے اثرات کو ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت زائل کیا جارہا ہے۔ ہم اس دین کی صداقت کے دعویدار بھی ہیں لیکن اس کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات بھی پھیلاتے رہتے ہیں۔ کبھی ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کو اپنانے سے ہماری ترقی رک جائے گی، ہماری معیشت تباہ ہو گی، ہماری سیاسی ساکھ برباد ہو کر رہ جائے گی۔ ہم دنیا کی نظروں میں ایک پسماندہ قوم کی حیثیت سے دیکھے جائیں گے۔

ہمیں اس دین کی صحت پر کامل یقین اور بھروسہ نہیں رہا اس لیے ہم میں ایسے کئی لوگ اس کی تراش خراش کرنے میں مصروفِ عمل ہیں تاکہ اسے مغربی تہذیب و تمدن کی صورت میں ڈھالا جاسکے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو انہوں نے اس مقدس ذات کی تصریحات کو بے وزن بنانے کی مذموم کوششیں کی ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے عملی نفاذ کے لیے مبعوث کیا تھا۔ یہ تصریحات اس دین کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس رکاوٹ کے دور ہو جانے کے بعد اب ہر قسم کی تبدیلی کے دروازے کھل گئے ہیں۔ چنانچہ وہ دین جو اپنے دائرہ میں کسی غیر اسلامی عنصر کے ساتھ مصالحت گوارا نہیں کر سکتا اُس کا حلیہ اب اس حد تک بگاڑا جا چکا ہے کہ اُس کے اندر روحانیت کا کوئی جوہر اب باقی نہیں رہا۔ حشر و نشر، جزا و سزا، اللہ کی بندگی اور رسول کی اطاعت، فرشتے اور تقدیر، جنت اور دوزخ ان میں سے کسی ایک کا یا تو کھلے بندوں انکار کیا گیا ہے یا ان کی ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جن سے ان کا حقیقی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

عملی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو صورتِ حال اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ اللہ کا خوف لوگوں کے دلوں سے بالکل مٹ چکا ہے۔ احساسِ جوابدہی کے چہرے پر (باقی صـ۱۲ پر)

تفہیم القرآن

الصّافّات

(۲)

ہم کو[۳۹] اس سے پہلے، نوحؑ نے پکارا تھا[۴۰]، تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے اُس کو اور اس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے بچا لیا[۴۱]، اور اسی کی نسل کو باقی رکھا[۴۲]، اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوحؑ پر تمام دنیا والوں میں[۴۳]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔

۳۹؎ اس مضمون کا تعلق پچھلے رکوع کے آخری فقروں سے ہے۔ اُن پر غور کرنے سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ قصے یہاں کس غرض سے سنائے جا رہے ہیں۔

۴۰؎ اس سے مراد وہ فریاد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے مدتہائے دراز تک اپنی قوم کو دعوتِ دینِ حق دینے کے بعد آخرکار مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ اس فریاد کے الفاظ سورۂ قمر میں اس طرح آئے ہیں فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ "اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں، اب تو میری مدد کو پہنچ" (آیت ۱۰)

۴۱؎ یعنی اُس شدید اذیت سے جو ایک بدکردار اور ظالم قوم کی مسلسل مخالفت سے ان کو پہنچ رہی تھی اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اُس کربِ عظیم سے بچایا گیا، اسی طرح آخرکار ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو بھی اس کربِ عظیم سے بچا لیں گے جس میں اہلِ مکہ نے ان کو مبتلا کر رکھا ہے۔

۴۲؎ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ حضرت نوحؑ کی مخالفت کر رہے تھے ان کی نسل [illegible]

اور نوح ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا[44]۔ جب اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا[45] "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر اللہ رب العٰلمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے[46]؟"

پھر اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی[47] اور کہا میری طبیعت خراب ہے[48]۔ چنانچہ وہ لوگ اسے

سے ناپید کر دی گئی اور حضرت نوح ہی کی نسل باقی رکھی گئی۔ دوسرے یہ کہ تمام نسلِ انسانی ختم کر دی گئی اور آگے صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد سے دنیا آباد کی گئی۔ عام طور پر مفسرین نے اسی دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے مگر قرآن مجید کے الفاظ اس معنی میں صریح نہیں ہیں اور حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۴۳ یعنی آج دنیا میں حضرت نوح کی برائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ طوفانِ نوح کے بعد سے آج تک ہزارہا برس سے دنیا ان کا ذکرِ خیر ہی کر رہی ہے۔

۴۴ رب کے حضور آنے سے مراد اس کی طرف رجوع کرنا اور سب سے منہ موڑ کر اُسی کا رخ کرنا ہے۔ اور "قلبِ سلیم" کے معنی "محفوظ دل" کے ہیں۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو، جس میں کفر و شرک اور شکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ ہو، جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو، جس میں کوئی اینچ پینچ اور الجھاؤ نہ ہو، جو ہر قسم کے بُرے میلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو، جس کے اندر کسی کے لیے بغض و حسد یا بدخواہی نہ پائی جاتی ہو، جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔

۴۵ حضرت ابراہیم کے اس قصے کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۵۲ تا ۵۶۰۔ جلد سوم ص ۶۹ تا ۷۰۔ ۱۶۴ تا ۱۷۰۔ ۴۹۹ تا ۵۰۶۔ ۶۸۶ تا ۶۹۴

۴۶ یعنی اللہ تعالیٰ کو آخر تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ لکڑی پتھر کے معبود اس کے ہم جنس ہو سکتے ہیں؟ یا اس کی صفات اور اس کے اختیارات میں شریک ہو سکتے ہیں؟ اور کیا تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اس کے ساتھ اتنی بڑی گستاخی کر کے تم اس کی پکڑ سے بچے رہ جاؤ گے؟

۴۷ اب ایک خاص واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کی تفصیلات سورۂ انبیاء (آیات ۵۱ تا ۷۳) میں

چھوڑ کر چلے گئے۔[۵۳] ان کے پیچھے وہ چپکے سے اُن کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا "آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں؟[۵۴] کیا ہو گیا، آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟" اس کے بعد وہ اُن پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آکر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے۔[۵۵] اس نے کہا "کیا تم

سورۂ عنکبوت (آیات ۱۶ تا ۲۷) میں گزر چکی ہیں۔

۵۱ ابن ابی حاتم نے مشہور تابعی مفسر قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اہلِ عرب نَظَرَ فِی النُّجُومِ (اس نے تاروں پر نگاہ ڈالی) کے الفاظ محاورے کے طور پر اس معنی میں بولا کرتے ہیں کہ اس شخص نے غور کیا، یا وہ شخص سوچنے لگا۔ علامہ ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ویسے بھی یہ بات اکثر مشاہدے میں آتی ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے کوئی غور طلب معاملہ آتا ہے تو وہ آسمان کی طرف، یا اوپر کی جانب کچھ دیر دیکھتا رہتا ہے، پھر سوچ کر جواب دیتا ہے۔

۵۲ یہ اُن تین باتوں میں سے ایک ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زندگی میں یہ تین جھوٹ بولے تھے۔ حالانکہ اس بات کو جھوٹ، یا خلافِ واقعہ کہنے کے لیے پہلے کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی اور انہوں نے محض بہانے کے طور پر یہ بات بنا دی تھی۔ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو خواہ مخواہ اسے جھوٹ آخر کس بنا پر قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم تفہیم القرآن جلد سوم (صفحہ ۱۶۷-۱۶۸) میں کر چکے ہیں، اور مزید بحث رسائل و مسائل، جلد دوم (صفحہ ۳۵ تا ۳۹) میں کی گئی ہے۔

۵۳ یہ فقرہ خود بخود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ صورت معاملہ دراصل کیا تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے لوگ اپنے کسی میلے میں جا رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیم کے خاندان والوں نے اُن سے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہو گا۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی ہو گی کہ میری طبیعت خراب ہے، میں نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ بات بالکل ہی خلافِ واقعہ ہوتی تو ضرور گھر کے لوگ اُن سے کہتے کہ اچھے خاصے بھلے چنگے ہو، بلا وجہ بہانہ بنا رہے ہو۔ لیکن جب وہ اس عذر کو قبول کر کے انہیں پیچھے چھوڑ گئے تو اس سے خود ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ضرور اُس وقت حضرت ابراہیم کو نزلہ، کھانسی، یا کوئی اور ایسی ہی نمایاں تکلیف ہو گی جس کی وجہ سے گھر والے انہیں چھوڑ جانے پر راضی ہوئے۔

اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔" انہوں نے آپس میں کہا "اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔" انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا۔[۵۳]

---

۵۱ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مندر میں بتوں کے سامنے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی ہوں گی۔

۵۲ یہاں قصہ مختصر کر کے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اس کی جو تفصیل دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ جب انہوں نے آکر اپنے مندر میں دیکھا کہ سارے بُت ٹوٹے پڑے ہیں تو پوچھ گچھ شروع کی۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان بُت پرستی کے خلاف ایسی ایسی باتیں کرتا رہا ہے۔ اس پر مجمع نے کہا کہ پکڑ لاؤ اُسے۔ چنانچہ ایک گروہ دوڑتا ہوا اُن کے پاس پہنچا اور انہیں مجمع کے سامنے لے آیا۔

۵۳ سورۂ انبیاء (آیت ۶۹) میں الفاظ یہ ہیں: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (ہم نے کہا، اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے)۔ اور سورۂ عنکبوت (آیت ۲۴) میں ارشاد ہوا ہے فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (پھر اللہ نے اس کو آگ سے بچا لیا)۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینک دیا تھا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بسلامت نکال دیا۔ آیت کے یہ الفاظ کہ "انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انہیں نیچا دکھا دیا" اس معنی میں نہیں لیے جا سکتے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکنا چاہا تھا مگر نہ پھینک سکے۔ بلکہ مذکورۂ بالا آیات کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے اُن کا صاف مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ میں پھینک کر انہیں ہلاک کر دینا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے اور اُن کے معجزانہ طریقہ سے بچ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی برتری ثابت ہو گئی اور مشرکین کو اللہ نے نیچا دکھا دیا۔ اِس واقعہ کو بیان کرنے سے اصل مقصود قریش کے لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ جن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو اُن کا طریقہ وہ نہ تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے، بلکہ وہ تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ اب اگر تم اِن کو نیچا دکھانے کے لیے وہ چالیں چلو گے جو حضرت ابراہیم کی قوم نے اُن کے ساتھ چلی تھیں تو آخر کار نیچا تم ہی دیکھو گے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا تم نہیں دکھا سکتے۔

ابراہیم نے کہا[۵۴] "میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں[۵۵]، وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو[۵۶]۔" (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی[۵۷]۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا، "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں[۵۸]، اب تو بتا،

---

۵۴ یعنی آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ نے ملک سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو چلتے وقت یہ الفاظ کہے۔

۵۵ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی خاطر نکل رہا ہوں کیونکہ اسی کا ہو جانے کی وجہ سے میری قوم میری دشمن ہو گئی ہے ورنہ کوئی دنیوی جھگڑا میرے اور اس کے درمیان نہ تھا کہ اس کی بنا پر مجھے اپنا وطن چھوڑنا پڑ رہا ہو۔ نیز یہ کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے جس کا رخ کروں۔ تن تقدیر بس اللہ کے بھروسے پر نکل رہا ہوں۔ جدھر وہ لے جائے گا اسی طرف چلا جاؤں گا۔

۵۶ اس دعا سے خود بخود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وقت بے اولاد تھے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک بیوی اور ایک بھتیجے (حضرت لوطؑ) کو لے کر ملک سے نکلے تھے۔ اس وقت فطرۃً آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ اللہ کوئی صالح اولاد عطا فرمائے جو اس غریب الوطنی کی حالت میں آپ کا غم غلط کرے۔

۵۷ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ دعا کرتے ہی یہ بشارت دے دی گئی۔ قرآن مجید ہی میں ایک دوسرے مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ "شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے" (سورۂ ابراہیم، آیت ۳۹)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اس بشارت کے درمیان سالہا سال کا فصل تھا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی (پیدائش ۱۶:۱۶) اور حضرت اسحاق کی پیدائش کے وقت سو برس کی (۲۱ : ۵)۔

۵۸ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے

تیرا کیا خیال ہے؟[59] اس نے کہا "اباجان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے[60] اسے کر ڈالیے، آپ انشاء اللہ
مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔" آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے
کے بل گرا دیا[61] اور ہم نے ندا دی[62] کہ "اے ابراہیم، تو نے خواب سچ کر دکھایا[63]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو

بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ اسے ذبح کر رہے ہیں۔ اگرچہ اُس وقت وہ خواب کا مطلب یہی سمجھے تھے کہ وہ صاحبزادے کو ذبح کر دیں۔ اسی بنا پر وہ ٹھنڈے دل سے بیٹا قربان کر دینے کے لیے بالکل تیار ہو گئے تھے۔ مگر خواب دکھلانے میں جو باریک نکتہ اللہ تعالیٰ نے ملحوظ رکھا تھا اُسے آگے کی آیت نمبر ۱۰۵ میں اس نے خود کھول دیا ہے۔

۵۹ صاحبزادے سے یہ بات پوچھنے کا مدعا یہ نہ تھا کہ تو راضی ہو تو خدا کے فرمان کی تعمیل کروں ورنہ نہ کروں۔ بلکہ حضرت ابراہیم دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس صالح اولاد کی انہوں نے دعا مانگی تھی، وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے۔ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان قربان کر دینے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی ان کا سپوت ہے۔

۶۰ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر باپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اب اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحۃً یا اشارۃً اس امر کی تصریح فرما دیتا کہ فرزندِ ابراہیم نے غلط فہمی سے اس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سیاق و سباق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیاء کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات سے ایک، اتنا بڑا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہو سکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے والے کے لیے یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی بھول چوک بھی صادر ہو سکتی ہے۔

۶۱ یعنی حضرت ابراہیم نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو چت نہیں لٹایا بلکہ اوندھے منہ لٹایا تاکہ ذبح کرتے وقت بیٹے کا چہرہ دیکھ کر کہیں محبت و شفقت ہاتھ میں لرزش پیدا نہ کر دے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ پیچھے کی طرف سے ہاتھ ڈال کر چھری چلائیں۔

ایسی ہی جزا دیتے ہیں[۶۴]۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی[۶۵]۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا[۶۶]۔ اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے

۶۲؎ نحویوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں "اور" بمعنی "تو" ہے، یعنی فقرہ یوں ہے کہ "جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے ندا دی"۔ لیکن ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں لفظ "جب" کا جواب محذوف ہے اور اس کو ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ بات اتنی بڑی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے تصور ہی کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہو گا کہ بوڑھا باپ اپنے ارمانوں سے مانگے ہوئے بیٹے کو محض ہماری خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور بیٹا بھی گلے پر چھری چلوانے کے لیے راضی ہے، تو یہ منظر دیکھ کر کیسا کچھ دریائے رحمت نے جوش مارا ہو گا، اور مالک کو ان باپ بیٹوں پر کیسا کچھ پیار آیا ہو گا، اس کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں اُس کی کیفیت جتنی کچھ بھی بیان کی جائے گی وہ اس کو ادا نہیں کرے گی۔ بلکہ اس کی اصلی شان سے کچھ گھٹ کر ہی ہو گی۔

۶۳؎ یعنی ہم نے تمہیں یہ تو نہیں دکھایا تھا کہ تم نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے اور اُس کی جان نکل گئی ہے، بلکہ یہ دکھایا تھا کہ تم ذبح کر رہے ہو۔ تو وہ خواب تم نے پورا کر دکھایا۔ اب ہمیں تمہارے بچے کی جان لینی مطلوب نہیں ہے۔ اصل مدعا جو کچھ تھا وہ تمہاری اس آمادگی اور تیاری سے حاصل ہو گیا ہے۔

۶۴؎ یعنی جو لوگ احسان کی روش اختیار کرتے ہیں ان کے اوپر آزمائشیں ہم اس لیے نہیں ڈالا کرتے کہ انہیں خواہ مخواہ تکلیفوں میں ڈالیں اور رنج و غم میں مبتلا کریں۔ بلکہ یہ آزمائشیں ان کی فضیلتوں کو اُبھارنے کے لیے اور انہیں بڑے مرتبے عطا کرنے کے لیے ان پر ڈالی جاتی ہیں، اور پھر آزمائش کی خاطر جس مخمصے میں ہم انہیں ڈالتے ہیں اُس سے بخیریت ان کو نکلوا بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو، بیٹے کی قربانی کے لیے تمہاری آمادگی و تیاری ہی بس اس کے لیے کافی ہو گئی کہ تمہیں وہ مرتبہ عطا کر دیا جائے جو ہماری خوشنودی پر واقعی بیٹا قربان کر دینے والے کو مل سکتا تھا۔ اس طرح ہم نے تمہارے بچے کی جان بھی بچا دی اور تمہیں یہ مرتبۂ بلند بھی عطا کر دیا۔

۶۵؎ یعنی مقصود تمہارے ہاتھ سے تمہارے بچے کو ذبح کرا دینا نہ تھا، بلکہ اصل مقصود تمہارا امتحان لینا تھا کہ تم ہمارے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز تر تو نہیں رکھتے۔

ابراہیمؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔ اور اسے اور اسحاق کو برکت دی۔ ۶۷

۶۶ "بڑی قربانی" سے مراد، جیسا کہ بائیبل اور اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے، ایک مینڈھا ہے جو اس وقت اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے پیش کیا تاکہ بیٹے کے بدلے اس کو ذبح کر دیں۔ اسے بڑی قربانی کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ وہ ابراہیمؑ جیسے وفادار بندے کے لیے فرزندِ ابراہیمؑ جیسے صابر و جان نثار لڑکے کا فدیہ تھا، اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر قربانی کی نیت پوری کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اسے "بڑی قربانی" قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری کر دی کہ اسی تاریخ کو تمام اہلِ ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتے رہیں۔

۶۷ یہاں پہنچ کر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جن صاحبزادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور جنہوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا، وہ کون تھے۔ سب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائیبل کی طرف سے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

"خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام . . . تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لیکر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔" (پیدائش، ۲۲: ۱-۲)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحٰق اکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائیبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں:

"اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے سو تو میری لونڈی کے پاس جا۔ شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات

مانی سارہ ابرام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی "

(پیدائش، ۱۶ : ۱-۳)

"خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام اسمٰعیل رکھنا" (۱۶ : ۱۱)

"جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا" (۱۶ : ۱۶)

اور خداوند نے ابرہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے ..... اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا ..... تو اس کا نام اضحاق رکھنا ..... جو اگلے سال اسی وقت معین پر سارہ سے پیدا ہوگا ..... تب ابرہام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اور ..... گھر کے سب مردوں کو لیا اور اسی روز خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔ ابرہام ننانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا اور جب اسماعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا (پیدائش ۱۷ : ۱۵ - ۲۵)

اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا (پیدائش، ۲۱ : ۵)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی صاف کھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسمٰعیل ہی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاق نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیل تھے۔ اور اگر حضرت اسحاق کی مانگی گئی تھی تو وہ اکلوتے نہ تھے۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں اور ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مفسرین نے صحابہ و تابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے، اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمر۔ حضرت علی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب۔ حضرت عبداللہ بن عباس۔ حضرت ابوہریرہ۔ قتادہ۔ عکرمہ۔ حسن بصری۔ سعید بن جبیر۔ مجاہد۔ شعبی۔ مسروق۔ مکحول۔ زہری۔ عطاء

مقاتل ۔ سُدّی ۔ کعب احبار ۔ زید بن اسلم وغیرہم ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیل تھے ۔ اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں :

حضرت ابوبکر ۔ حضرت علی ۔ حضرت عبداللہ بن عمر ۔ حضرت عبداللہ بن عباس ۔ حضرت ابوہریرہ ۔ حضرت معاویہ ۔ عکرمہ ۔ مجاہد ۔ یوسف بن مہران ۔ حسن بصری ۔ محمد بن کعب القُرظی ۔ شَعبی ۔ سعید بن المسیب ۔ ضحاک ۔ محمد بن علی بن حسین (محمد الباقر) ۔ ربیع بن انس ۔ احمد بن حنبل وغیرہم ۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے ۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول منقول ہوئے ہیں ۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس سے عکرمہ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے ۔ مگر انہی سے عطاء بن ابی رباح یہ بات نقل کرتے ہیں کہ زعمت الیھود انہ اسحٰق وکذبت الیھود (یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحٰق تھے، مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں) ۔ اسی طرح حضرت حسن بصری سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحٰق کے ذبیح ہونے کے قائل تھے ۔ مگر عمرو بن عُبَید کہتے ہیں کہ حسن بصری کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیم کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اس اختلافِ روایات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ علماء اسلام میں سے بعض پورے جزم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحٰق کے حق میں رائے دیتے ہیں، مثلاً ابن جریر اور قاضی عیاض ۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل تھے، مثلاً ابن کثیر ۔ اور بعض مذبذب ہیں، مثلاً جلال الدین سیوطی ۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیل ہی ذبیح تھے ۔ اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں ۔

۱ ۔ اوپر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیم نے ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی تھی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی ۔ فحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دعا اس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے ۔ اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی وہ آپ کا پہلوٹا بچہ تھا ۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے

کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم کے پہلوٹے صاحبزادے حضرت اسماعیل تھے نہ کہ حضرت اسحٰق۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ (ابراہیم۔ آیت ۳۹)

۲۔ قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحٰق کی بشارت دی گئی ہے وہاں ان کے لیے غُلامٍ علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ فَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الذاریات۔ ۲۸)۔ لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر۔ ۵۳)، مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اس کے لیے غلامٍ حلیم (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی دو الگ صفات تھیں۔ اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں بلکہ غلامِ حلیم کے لیے تھا۔

۳۔ قرآن مجید میں حضرت اسحٰق کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوب جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (ہود ۷۱)۔ اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا، اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیم کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں، تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحٰق کے ہاں حضرت یعقوب پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان صاحبِ اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ "ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ

کیا گیا تھا۔ بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی۔ پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ پھر جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اور بیٹے اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیب واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاق نہ تھے، بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے صرف حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ "ہم نے اس کو اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے" بلکہ یوں فرماتا کہ ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہو گا صالحین میں سے۔

۵۔ معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماعیل کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیر کا محاصرہ کیا اور خانۂ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابن عباس اور عامر شعبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے خود خانۂ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر)۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیل کے ساتھ پیش آیا تھا، اسی لیے تو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

۶۔ یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف روایت ہی نہ تھی بلکہ اُس وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آ رہا تھا کہ اُسی مقام منیٰ میں جا کر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے بھی اس طریقے کو جاری رکھا، حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس

امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیل ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحٰق۔ حضرت اسحٰق کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود امتِ مُسلمہ میں حضرت اسحٰق کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا۔ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کرکے اپنے دادا حضرت اسحٰق کی طرف اسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہِ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کرلیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعبِ احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمر کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مندرجات اُن کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمر انہیں سُن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور سب رطب و یابس جو وہ بیان کرتے تھے انہیں روایت کرنے لگے۔ حالانکہ اس امت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔"

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قُرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاق تھے یا حضرت اسماعیل۔ اُس وقت ایک ایسے صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہوچکے تھے۔ انہوں نے کہا "امیر المؤمنین، خدا کی قسم وہ اسماعیل ہی تھے، اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاق تھے" (ابن جریر)۔ ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈا کا اثر تھا جو لازماً

مع اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے[۵۸] ع

میں پھیل گیا۔ اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں۔ اس لیے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو۔ جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالہ سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کارفرما ہے۔

۵۸ے یہ فقرہ اُس پورے مقصد پر روشنی ڈالتا ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کا یہ قصہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے دو بہت بڑی قومیں پیدا ہوئیں۔ ایک بنی اسرائیل جن کے گھر سے دنیا کے دو بڑے مذہب (یہودیت اور نصرانیت) نکلے اور انہوں نے روئے زمین کے بہت بڑے حصے کو حلقہ بگوش بنایا۔ دوسرے بنی اسماعیل جو نزولِ قرآن کے وقت تمام اہلِ عرب کے مقتدا و پیشوا تھے، اور اُس وقت مکۂ معظمہ کے قبیلۂ قریش کو اُن میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا۔ نسلِ ابراہیمی کی ان دونوں شاخوں کو جو کچھ بھی عروج نصیب ہوا وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ان دو عظیم المرتبت صاحبزادوں کے ساتھ انتساب کی بدولت ہوا، ورنہ دنیا میں نہ معلوم ایسے ایسے کتنے خاندان پیدا ہوئے ہیں اور گوشۂ گمنامی میں جا پڑے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ اس خاندان کی تاریخ کا سب سے زیادہ زرّیں کارنامہ سنانے کے بعد ان دونوں گروہوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ تمہیں دنیا میں یہ جو کچھ شرف نصیب ہوا ہے وہ خدا پرستی اور اخلاص و فدویت کی اُن شاندار روایات کی وجہ سے ہوا ہے جو تمہارے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام نے قائم کی تھیں۔ وہ انہیں بتاتا ہے کہ ہم نے اُن کو جو برکت عطا فرمائی اور ان پر اپنے فضل و کرم کی جو بارشیں برسائیں، یہ کوئی اندھی بانٹ نہ تھی کہ بس یونہی ایک شخص اور اس کے دو لڑکوں کو چھانٹ کر نواز دیا گیا ہو، بلکہ انہوں نے اپنے مالکِ حقیقی کے ساتھ اپنی وفاداری کے کچھ ثبوت دیئے تھے اور ان کی بنا پر وہ ان عنایات کے مستحق بنے تھے۔ اب تم لوگ محض اس فخر کی بنا پر کہ تم ان کی اولاد ہو، ان عنایات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ ہم تو یہ دیکھیں گے کہ تم میں سے محسن کون ہے اور ظالم کون۔ پھر جو جیسا ہو گا، اُس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہم کریں گے۔

ممکن تھا کہ وہ فوج اِن لوگوں کے دل نہ جیت لیتی جو علاقوں پر علاقے فتح کرتی ہے مگر کہیں کسی کی عزت وآبرو پہ ہاتھ نہیں ڈالتی۔

ان سنتے فاتحوں نے اخلاق کا یہ نرالا کرشمہ بھی دکھایا کہ اگر دشمن کے دباؤ سے کبھی کوئی جیتا ہوا علاقہ انہیں چھوڑنا پڑ گیا تو نظم ونسق کے لیے عوام سے جو ٹیکس انہوں نے وصول کیے تھے وہ سب یہ کہہ کر انہیں واپس کر دیتے کہ یہ ٹیکس ہم نے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے وصول کیے تھے۔ اب چونکہ ہم اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے اس لیے تمہارا روپیہ واپس کرتے ہیں۔ لوگ اس وقت تک جن حکمرانوں سے واقف تھے ان کا حال یہ تھا کہ اگر کبھی انہیں کوئی علاقہ چھوڑنا پڑ جاتا تھا تو لیا ہوا روپیہ واپس کرنا تو درکنار، جو کچھ لوگوں کے پاس ہوتا تھا وہ بھی لوٹ کر چلتے بنتے تھے یہ اولیاء اور انبیاء کا سا اخلاق کسی ساکر گروہ میں دیکھنے کی کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ سیاست و ملک داری میں اس امانت و دیانت سے کام لے گا۔

یہ تھی وہ اصل طاقت جس سے ابتدائی دور کے مسلمانوں نے دُنیا کے ایک بڑے حصے کو مسخر کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلواروں نے جتنا کام کیا اس سے کہیں زیادہ کام ان کے اخلاق اور کردار نے کیا۔ چونکہ ایک ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ اسلام کو سمجھ کر ایمان لایا تھا اور سمجھنے کے بعد پھر اس کے مطابق اس نے اپنی سیرت بنا لی تھی، اس لیے جس حیثیت میں بھی انہوں نے کام کیا اس میں اسلام کی صحیح نمائندگی کی، اور اسی وجہ سے دُنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکی۔ ان کی تلوار کی کاٹ سے پہلے ان کے اخلاق کی کاٹ لوگوں کے دلوں کے اندر اتر چکی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جو علاقے انہوں نے فتح کیے وہاں کی آبادی اُن کی سیاسی غلام نہیں بنی بلکہ ان کی مرید اور معتقد بن گئی۔ اس نے ان کا مذہب اختیار کر لیا۔ اُن کی تہذیب قبول کر لی۔ حتیٰ کہ ان کی زبان بھی اختیار کر لی۔ آج وہ مفتوح آبادی اپنے ان فاتحوں کو اپنا ہیرو اور اپنا مقتدا مانتی ہے، اور اپنی ہی قوم کے کافر اسلاف کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے راضی نہیں ہے۔ کیا دُنیا میں کبھی کسی تلوار نے بھی یہ کرشمہ دکھایا ہے؟

۵ ارب سال پہلے بھی وہی حقیقت تھی اور ۵ ارب سال بعد بھی وہی حقیقت رہے گی۔ ۵ ارب سال پہلے بھی یہ حقیقت تھی کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا تھا اور ۵ ارب سال بعد بھی یہی حقیقت ہوگی کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا رہے گا۔ یہ حقیقت بھی ازلی اور ابدی ہے کہ مخلوق کا کام خالق کی بندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب بھی کوئی مخلوق پائی جائے گی لامحالہ خالق کی بندگی ہی کرنا اس کا کام ہوگا۔ اس لحاظ سے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کے بارے میں آج اور کل اور ماضی و حال اور مستقبل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب اگر اس عنوان کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں تو وہ دو ہی ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا طرزِ عمل آج کیا ہے؟ مسلمان اس زمانہ میں اسلام کے متعلق کیا رویہ رکھتے ہیں؟ اور ان کی زندگی میں اسلام کے کیا اثرات ہیں اور کیا نہیں ہیں؟ دوسرے معنی یہ کہ اسلام کو آج کی دنیا قبول کر سکتی ہے یا نہیں کر سکتی؟ کر سکتی ہے تو کیسے کر سکتی ہے؟ اور کوئی شخص اگر بہت زیادہ آگے بڑھ کر اس کے کچھ اور معنی لے سکتا ہے تو یہ بھی لے سکتا ہے کہ اسلام آج قابلِ عمل ہے یا نہیں؟

یہی دو سوال اس عنوان کے مفہوم میں آتے ہیں اور میں ان دونوں سوالات پر ترتیب وار آپ کے سامنے اپنے خیالات عرض کروں گا۔

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا آج کیا طرزِ عمل ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں اسلام کا کیا اثر پایا جاتا ہے اور کیا نہیں پایا جاتا، اور مسلمان اس کے بارے میں آج کیا رویہ رکھتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ آپ "اسلام اس زمانے میں" سے پہلے "اسلام پچھلے زمانے میں" پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ اس لیے کہ ہم آج جو کچھ بھی ہیں، وہ گذشتہ کل کے نتیجہ میں ہیں اور جو کچھ آئندہ ہونے والے ہیں وہ آج جو کچھ حالات ہیں ان کے نتیجے میں ہوں گے۔ لہٰذا اسلام کے بارے میں مسلمانوں کا آج جو رویہ ہے اسے سمجھنے سے پہلے کل جو رویہ تھا اس کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ ہم معلوم کریں کہ ہمارا

آج کا رویہ کن تاریخی اسباب کی بنا پر ہے اور اسی سے پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مستقبل میں یہ رویہ کیا صورت اختیار کر سکتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر ہم ایک تاریخی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمان اپنی تاریخ کے دوران میں تین بڑے مرحلوں سے گزرتے ہوئے آرہے ہیں اور اس وقت ہم ایک چوتھے مرحلے میں ہیں۔

پہلا مرحلہ

ہماری تاریخ کا سب سے پہلا مرحلہ وہ تھا جب اسلام کا آغاز ہوا۔ ایک شخص واحد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے لیے مامور کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی توحید اور آخرت کے عقیدے اور رسالت کے اتباع کی بنیادوں پر انسانی زندگی کی تعمیر کے لیے کوشش کرے۔ اس ایک بندہ حق نے ۱۳ برس تک مکۂ معظمہ میں اس دعوت کو خلقِ خدا کے سامنے پیش کیا، اور محض زبان ہی سے پیش نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی کے ایک ایک عمل سے، اپنی حرکات و سکنات سے، اپنے رویہ سے، اپنے برتاؤ سے، غرض اپنی ایک ایک چیز سے اُس شخصیت کبریٰ نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ اسلام کس قسم کا انسان بنانا چاہتا ہے، کس قسم کے اخلاق بنانا چاہتا ہے، کس سیرت کا طالب ہے، کیا رویہ اس دنیا کی زندگی میں ایک ایسے شخص کا ہونا چاہیئے جو اسلام کو ماننے اور قبول کرنے۔ جو کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور جو نمونہ آپ خود تھے۔

اس دعوت کو سن کر اور اس نمونے کو دیکھ کر خلقِ خدا میں سے وہ لوگ آپ کے ساتھ شامل ہوتے چلے گئے جنہوں نے پوری ایمانداری اور پورے اخلاص، اور پورے فہم اور پورے شعور کے ساتھ اس چیز کو اچھی طرح جان کر قبول کیا۔ ناسمجھی کے ساتھ کوئی ایک آدمی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں آیا۔ اور جب کوئی شخص خوب سوچ سمجھ کر آیا تو پھر اس نے اپنی زندگی کو ٹھیک ٹھیک اس سانچے کے مطابق ڈھال لیا جس سانچے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ دعوت چاہتی تھی کہ وہ ڈھلے۔ ۱۳ برس بیتے میں مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام لائے تھے

ان میں سے ایک ایک آدمی کی زندگی میں عملاً وہ انقلاب رونما ہوا تھا جو اسلام حیاتِ انسانی میں رونما کرنا چاہتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ ان کے اندر عملاً وہ انقلاب برپا ہوا تھا بلکہ اس انقلاب کے راستہ میں جتنی داخلی اور خارجی طاقتیں مزاحم تھیں ان سب کے ساتھ انہوں نے مجاہدہ کیا، کشمکش کی، بڑی سے بڑی قربانیاں جو انسان کسی مقصد کے لیے دے سکتا ہے اس سلسلہ میں انہوں نے دیں، بڑے سے بڑے نقصانات برداشت کئے، اس لئے کہ ان کے نزدیک دُنیا کی سب سے بڑی قدر وہ تھی جو اسلام کے ذریعہ سے انہیں ملی تھی۔ اُس کو وہ دُنیا کی کسی اور چیز پر قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور ہر چیز کو اس کے اوپر قربان کر دینے کے لیے تیار تھے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کے اندر پوری طاقت کے ساتھ یہ جذبہ اُبھر آیا تھا کہ جس نظریۂ حیات پر وہ ایمان رکھتے ہیں اسے دُنیا میں غالب کر کے چھوڑیں گے، اور وہ جان کی بازی لگا کر بھی اس امکان کو ختم کر دینے پر تُل گئے تھے کہ کوئی باطل نظریۂ حیات اُن پر غالب ہو۔

اس طرح ۱۳ برس کی مختصر مدت میں مٹھی بھر جان نثاروں کا جو گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کیا تھا اسے لے کر آپ مدینہ طیبہ منتقل ہو گئے اور وہاں ایک بہت چھوٹی سی ریاست قائم کر دی جس کا رقبہ شاید آج کے ایک معمولی قصبے کے رقبہ سے زیادہ نہ تھا جس کی آبادی بمشکل اُس وقت چھ سات ہزار ہوگی۔ اتنے چھوٹے علاقہ میں ایک ریاست قائم ہوتی ہے اور وہ پورے عرب کو چیلنج کر دیتی ہے۔ ایک طرف پورا عرب ہے اور ایک طرف وہ چھوٹی سی ریاست۔ اس ریاست میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی جاہلیت کے علی الرغم بالکل ایک نیا معاشرہ بنانا شروع کر دیا اور چند سال کے اندر وہ نمونہ تیار کر کے سارے عرب کے سامنے رکھ دیا جسے دیکھ کر ہر شخص علانیہ یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اسلام انسانی تہذیب و تمدن کو کیا شکل دینا چاہتا ہے اور اس میں اخلاق کی کیسی روح جاری و ساری کرنا اس کے پیش نظر ہے۔ اسلام جس عدل کی دعوت دیتا ہے اُس معاشرے اور ریاست میں وہ عملاً قائم کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ اسلام جیسا پاکیزہ معاشرہ بنانا چاہتا ہے وہاں وہ بالفعل پیدا کر کے دکھا دیا گیا۔ اسلام معاشی زندگی میں جو اصلاح کرنا چاہتا

ہے وہاں اس کو نافذ کر کے دکھا دیا گیا۔ غرض ہر وہ چیز جس کے لیے اسلام دعوت دیتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وہاں عملاً قائم کر کے دکھایا تاکہ لوگ محض کانوں ہی سے نہ سنیں بلکہ آنکھوں سے دیکھ لیں کہ کیا ہے اسلام اور کیا ہیں اس کی برکات اور کس طرح اسے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

اب یہ انسانی تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ بلکہ معجزہ ہے کہ ۸ برس کی مختصر سی مدت میں ایک قصبے کی چھوٹی سی ریاست، جو چند مربع میل اور چند ہزار انسانوں پر مشتمل تھی، پورے عرب پر چھا گئی۔ صرف آٹھ برس کے اندر دس بارہ لاکھ مربع میل کا پورا ملک مسخر ہو گیا، اور مسخر بھی اس طرح ہوا کہ لوگ محض ایک سیاسی نظام ہی کے تابع نہیں ہو گئے بلکہ ان کے نظریات تبدیل ہو گئے۔ ان کی قدریں بدل گئیں، ان کے اخلاق بدل گئے، ان کے معاشرتی طور طریقوں میں عظیم الشان اصولی تغیر رونما ہو گیا۔ ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی روح اور شکل دونوں میں ایک ایسی انقلابی تبدیلی واقع ہوئی جس نے عرب ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا رخ بدل ڈالا۔ ان کے افراد نے فرداً فرداً اور ان کی قوم نے بحیثیت مجموعی سوچنے کا ایک نیا انداز، برتاؤ کا ایک نیا طریقہ، اور زندگی کا ایک نیا مقصد اختیار کر لیا جس سے وہ اپنی صدہا برس کی تاریخ میں کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ صدیوں کی طوائف الملوکی ختم کر کے اس ملک کو ایک سیاسی نظام کے تحت لے آنا بھی کوئی چھوٹا کارنامہ نہ تھا۔ مگر اس سے ہزاروں درجہ زیادہ بڑا کارنامہ یہ فکری و اخلاقی اور تہذیبی و تمدنی انقلاب تھا۔ افسوس ہے کہ تاریخ نگاری کے ایک غلط طریقے نے اس عظیم تغیر کو محض غزوات کے نتیجے کی حیثیت سے پیش کر دیا، اور فرنگی مستشرقین نے اس پر خوب ڈھول پیٹا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ حالانکہ وہ تمام لڑائیاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئیں، ان میں مجموعی طور پر دونوں طرف کے بمشکل ۱۴ سو آدمی مارے گئے تھے۔ کسی کے پاس عقل ہو تو وہ خود غور کرے کہ اتنی کم خونریزی کے ساتھ اتنا بڑا انقلاب کہیں تلوار کے بل پر بھی ہو سکتا ہے؟

دراصل اس تغیر عظیم کی وجہ کچھ اور تھی۔ جب تک مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دیتے رہے، بہت کم لوگ اسے اور اس کے مضمرات کو سمجھ سکے۔ اس وقت تک

وہی لوگ اُسے سمجھے جو بہت زیادہ اعلیٰ درجہ کا فہم و شعور رکھتے تھے، بڑا صاف اور بے کدورت ذہن رکھتے تھے اور اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ جاہلیت کے تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر ایک حق بات کو محض حق ہونے کی بنا پر سمجھ بھی لیں، مان بھی لیں، عملاً اس کی پیروی بھی اختیار کر لیں، اور پھر سر دھڑ کی بازی لگا کر اس کی علمبرداری کے لیے بھی اُٹھ کھڑے ہوں۔ مگر جب ان صفات کی ایک مختصر سی جماعت تیار ہو گئی اور اس کو لے کر حضورؐ نے مدینے میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کر دیا، اور ایک آزاد اسلامی ریاست کی زمام اقتدار ہاتھ میں لے کر آپ نے اسلام کی پوری اصلاحی اسکیم کو اُس معاشرے میں روبعمل لانا شروع کر دیا تو حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اب لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہاں کیسا امن ہے۔ کیسی نیکی اور خدا ترسی ہے۔ کیسی راست بازی اور ایمان داری ہے۔ یہاں کیسی عدالت ہوتی ہے۔ یہاں کس طرح اُونچ نیچ برابر کی گئی ہے۔ یہاں کیسے اخوت اور مساوات قائم کی گئی ہے۔ یہاں کس طرح معاشی زندگی کی مشکلات اور اُلجھنوں اور خرابیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ یہاں کتنا پاکیزہ اور کتنا ستھرا اور کس قدر اعلیٰ درجہ کا معاشرہ تیار کیا گیا ہے جو تمام اخلاقی گندگیوں سے پاک ہے۔ اب آنکھیں رکھنے والے انسانوں کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس روشنی کا انکار کر دیں جسے وہ علانیہ اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ زمانۂ جاہلیت کے حالات کو بھی دیکھ چکے تھے جب انسانوں کو انسان کھائے جاتا تھا۔ جب قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور لوگ شراب، زنا، جوئے، چوری، ڈاکے اور ہر طرح کے اخلاقی فساد میں غرق تھے۔ اور اب اِس امن، اِس انصاف، اِس نیکی اور شرافت اور اس اخلاقی طہارت کو بھی اُن کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں جس کے نور سے مدینے کی اسلامی ریاست کا سارا ماحول جگمگا رہا تھا۔ اس کے بعد بہت ہی کم لوگ ایسے رہ گئے جن کی آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں اور جنہیں جاہلیت کی تاریکی ہی پسند تھی۔ اُن کو چھوڑ کر وہ سب لوگ اس صداقت کے قائل ہوتے چلے گئے جو اس کا زمانہ دیکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کشت و خون کر چکے تھے۔ خالد ابن ولید قائل ہوئے۔ عکرمہ بن ابی جہل قائل ہوئے، عمرو بن عاص قائل ہوئے حتیٰ کہ ابو سفیان اور ہند جگر خوار تک نے مان لیا کہ جس دعوت کے ثمرات و نتائج یہ کچھ ہیں وہی حق

ہے۔ اس لیے کہ اب انہوں نے چلتے پھرتے حق کو دیکھ لیا تھا۔ اب اسلام محض ایک تخیل نہ تھا جو محض ایک دعوت کی صورت میں ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو، بلکہ وہ اُسے زمین پر کام کرتے ہوئے اور انسانی زندگی میں اپنے عملی نتائج کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ایک پوری قوم ایسی تیار کر دی جس کی اجتماعی زندگی میں پورا کا پورا اسلام نافذ تھا، جس کے عقائد اور افکار و نظریات اسلامی تھے، جس کا مذہب خدائے واحد کے سوا کسی دوسرے کی بندگی اور پرستش سے آلودہ نہ تھا، جس کی انفرادی سیرتیں اور اجتماعی اخلاق جاہلیت سے پاک ہو کر اسلام کے سانچے میں ڈھل چکے تھے، جس کا تمدن اسلامی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھا اور جس کی ریاست کا پورا نظام اسلام کے قوانین پر چل رہا تھا۔ یہ پوری قوم اسلام کے لیے جینے اور اسلام کے لیے مرنے پر تیار ہو گئی۔ دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنے کو اس نے اپنا قومی نصب العین بنا لیا اور اس کی ریاست کا مقصد وجود ہی یہ قرار پا گیا کہ جہاں اسے اقتدار حاصل ہے وہاں اسلام کے اصولوں پر زندگی کا نظام چلائے، اور جہاں اسے اقتدار حاصل نہیں ہے وہاں اسلام کی دعوت پھیلائے۔ اس طرح دنیا میں ایک پوری قوم ایسی تیار ہو گئی جو خود اسلام پر عامل تھی اور روئے زمین پر اسلام پھیلانا اس کا قومی مشن تھا۔ ایک مکمل ریاست ایسی وجود میں آ گئی جو ایک طرف اپنے داخلی نظام میں اسلام کے اصولوں کا پورا عملی مظاہرہ کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ ساری دنیا میں اسلام کی علمبردار تھی۔

ایسی ایک قوم اور ایسی ایک ریاست بن جانے کے بعد جس طرح خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلام پھیلا ہے اس کے لیے تاریخ میں "انفجار" (EXPLOSION) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنی جیسے کوئی بم پھٹتا ہے اس طرح اسلام دنیا میں پھیلنا شروع ہو گیا اور چند سال کے اندر دیکھتے دیکھتے وہ افغانستان اور ترکستان سے لے کر شمالی افریقہ تک ایک سیلاب کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ یہ حیرت انگیز انفجار آخر کس چیز کا نتیجہ تھا؟ آج بھی آپ جا کر دیکھ لیجیے کہ عرب کے لوگ کتنے کچھ تنو مند ہیں۔ یہ بھی دیکھیے کہ عرب کی سرزمین میں کتنے کچھ ذرائع و وسائل ہیں۔ تیل کا ذکر نہ کیجیے

وہ تو آب برآمد ہوا ہے، اسے چھوڑ کر دیکھیے کہ وہاں کیا دھرا ہے ـــــ یہ بھی دیکھیے کہ عربوں کی تعداد کتنی ہے۔ شاید اس وقت جزیرۃ العرب کی آبادی ایک کروڑ سے بھی کم ہے اور خلافت راشدہ کے زمانے میں یقیناً اس سے بہت کم ہو گی۔ ایسی ایک قوم کا اتنے بڑے رقبۂ زمین پر یوں اچانک حاوی ہو جانا اور بڑی بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں ان کا اس طرح کامیاب ہو جانا درحقیقت مادی طاقت میں برتری کا نتیجہ نہ تھا۔ اصل چیز جس نے دُنیا کو مسخر کیا وہ پوری مسلمان قوم کا اور اس کے ایک ایک مسلم فرد کا وہ رویہ تھا جو صلح اور جنگ اور مفتوح علاقوں کے نظم و نسق اور مفتوح آبادیوں کے ساتھ برتاؤ میں ظاہر ہوتا تھا۔

ایران اور روم کی سلطنتوں کے ماتحت جو لوگ رہتے تھے انہوں نے اپنی آنکھوں سے کیا معنی کبھی اپنے تصور میں بھی وہ گورنر نہ دیکھے تھے جو سڑکوں پر پیدل چلیں، عام آبادیوں میں عام انسانوں کی طرح رہیں، ہر وقت اپنے دروازے اُن لوگوں کے لیے کھلے رکھیں جنہیں کسی مدد کی ضرورت ہو، اور جس آدمی کو بھی کوئی تکلیف پہنچے وہ ان کا دامن پکڑ کر کہہ سکے کہ مجھے یہ شکایت ہے اس کو رفع کیجیے۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی ایسے گورنر نہ دیکھے تھے اور نہ وہ سوچ سکتے تھے کہ دنیا میں ایسے بھی گورنر ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب اس مسلم معاشرے نے ان ممالک میں داخل ہو کر ایسے گورنر لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیئے تو آخر کتنے لوگ ایسے ہو سکتے تھے جو اندھے تعصب میں مبتلا ہو کر اس اخلاقی برتری کو تسلیم نہ کرتے؟

ان کی فوجوں نے دُنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کیا کہ ایک مفتوح شہر میں وہ داخل ہوتی ہیں، دونوں طرف بالاخانوں پر بنی ٹھنی عورتیں ان کے گزرنے کا تماشا دیکھنے کے لیے کھڑی ہیں، مگر ایک سپاہی بھی آنکھ اٹھا کر کسی بالاخانے کی طرف نہیں دیکھتا، پوری فوج گزر جاتی ہے اور اس کو پتہ نہیں چلتا کہ اوپر عورتیں کھڑی ہیں۔ یہ مفتوح لوگ صدیوں سے جو کچھ دیکھتے چلے آ رہے تھے اور ان کے باپ دادا نے جو قصے ان کو سنائے تھے وہ تو یہ تھے کہ جب کوئی فاتح فوج کسی بستی میں داخل ہوتی ہے تو اس کی ایک عورت کا دامن عصمت بھی تار تار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اب یہ کیسے

ممکن تھا کہ وہ فوج اِن لوگوں کے دل نہ جیت لیتی جو علاقوں پر علاقے فتح کرتی ہے مگر کہیں کسی کی عزت وآبرو پہ ہاتھ نہیں ڈالتی۔

ان فاتحوں نے اخلاق کا یہ نرالا کرشمہ بھی دکھایا کہ اگر دشمن کے دباؤ سے کبھی کوئی جیتا ہوا علاقہ انہیں چھوڑنا پڑ گیا تو نظم ونسق کے لیے عوام سے جو ٹیکس انہوں نے وصول کیے تھے وہ سب یہ کہہ کر انہیں واپس کر دیے کہ یہ ٹیکس ہم نے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے وصول کیے تھے۔ اب چونکہ ہم اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے اس لیے تمہارا روپیہ واپس کرتے ہیں۔ لوگ اس وقت تک جن حکمرانوں سے واقف تھے ان کا حال یہ تھا کہ اگر کبھی انہیں کوئی علاقہ چھوڑنا پڑ جاتا تھا تو لیا ہوا روپیہ واپس کرنا تو درکنار، جو کچھ لوگوں کے پاس ہوتا تھا وہ بھی لوٹ کر چلتے بنتے تھے۔ یہ اولیاء اور انبیاء کا سا اخلاق کسی حاکم گروہ میں دیکھنے کی کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ سیاست وملک داری میں اس امانت ودیانت سے کام لے گا۔

یہ تھی وہ اصل طاقت جس سے ابتدائی دور کے مسلمانوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو مسخر کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلواروں نے جتنا کام کیا اس سے کہیں زیادہ کام ان کے اخلاق اور کردار نے کیا۔ چونکہ ایک ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ اسلام کو سمجھ کر ایمان لایا تھا اور سمجھنے کے بعد پھر اس کے مطابق اس نے اپنی سیرت بنا لی تھی، اس لیے جس حیثیت میں بھی انہوں نے کام کیا اس میں اسلام کی صحیح نمائندگی کی، اور اسی وجہ سے دنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکی۔ ان کی تلوار کی کاٹ سے پہلے ان کے اخلاق کی کاٹ لوگوں کے دلوں کے اندر اُتر چکی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جو علاقے انہوں نے فتح کیے وہاں کی آبادی اُن کی سیاسی غلام نہیں بنی بلکہ ان کی مرید اور معتقد بن گئی۔ اُس نے ان کا مذہب اختیار کر لیا۔ اُن کی تہذیب قبول کر لی۔ حتیٰ کہ ان کی زبان بھی اختیار کر لی۔ آج وہ مفتوح آبادی اپنے ان فاتحوں کو اپنا ہیرو اور اپنا مقتدا مانتی ہے، اور اپنی ہی قوم کے کافر اسلاف کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے راضی نہیں ہے۔ کیا دنیا میں کبھی تلوار بھی یہ کرشمہ دکھا سکتی ہے؟

یہ ہماری تاریخ کا پہلا مرحلہ تھا۔ میرے پیشِ نظر اس وقت اس کی تفصیلات بیان کرنا نہیں ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے دراصل جو بات میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس مرحلۂ آغاز میں اسلام کو دُنیا کے بڑے حصّے پر جو زبردست غلبہ حاصل ہُوا تھا وہ صرف اس چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک پوری قوم نے بحیثیتِ مجموعی اس کو شعور اور اخلاص کے ساتھ اپنا لیا تھا، اس کے افراد کی سیرتوں میں اور اس کے اجتماعی کردار میں اسلام کا ٹھیک ٹھیک عملی مظاہرہ ہونے لگا تھا، اور ایک ایسی ریاست وجود میں آگئی تھی جو خدا کا کلمہ بلند کرنے کو اپنا نصب العین قرار دے کر اپنے تمام ذرائع و وسائل اس پر لگا دینے کے لیے تیار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام کو ابتداء ہی میں وہ پُرزور حرکت (MOMENTUM) ملی جس کے اثرات ۱۴ سو برس گزر جانے پر بھی آج تک چل رہے ہیں۔ اس گئی گزری حالت میں بھی آپ دیکھ لیں، آج بھی مسلمان قوم پر تاریخ کے اس ابتدائی مرحلے کا ٹھپّہ موجود ہے۔ ایک مسلمان خواہ کتنا ہی بگڑا ہُوا ہو اور کتنے ہی اس کے اخلاق خراب ہو چکے ہوں، مگر جب بھی آپ اس کو ٹٹول کر دیکھیں گے، آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے سامنے اگر کوئی مطمحِ نظر ہے تو وہی سوسائٹی ہے جو محمد رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں تھی۔ اُس مطمحِ نظر کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ گویا ایک آفتاب ہے جو ہر وقت اُس کے سامنے چمک رہا ہے اور وہ اسے نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ ہر مسلمان آج بھی اسی مثالی دور کو اپنے لیے نمونہ سمجھتا ہے، اسی کا گرویدہ ہے اور اُسی کو پھر ایک دفعہ دیکھنے کی تمنا دل میں لیے ہوئے ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد سے آج تک دُنیا میں اسلام برابر پھیلتا چلا گیا ہے اور روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس میں وہ نہ پہنچا ہو۔ اس کی یہ ساری ترقی اس کے باوجود ہوتی رہی کہ ہمارے اندر عیاش امراء بھی موجود رہے، ہم میں ظالم حکمران بھی موجود رہے، اور ہماری قوم میں بدکردار لوگوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ ایک مدتِ دراز سے ہم کوئی مثالی قوم نہیں ہیں جس کی کشش دنیا کو اپنی طرف کھینچے۔ اس کے باوجود اسلام جو دُنیا میں پھیلتا رہا ہے اور آج بھی پھیل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے

نمونہ کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ دراصل لوگ یہ سمجھتے ہوئے اس کو قبول کر رہے ہیں کہ اصل اسلام وہ ہے جس کا نمونہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء اور اصحاب نے پیش کیا تھا۔ اسی کو لوگ حق سمجھتے ہیں اور اسی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ پھر مسلمانوں میں آج تک خیال اور عمل اور سیرت و اخلاق کی جو بھلائی بھی پائی جاتی ہے وہ سب اسی ابتدائی دور کے باقی ماندہ اثرات ہیں جو تیرہ صدیوں کے بعد بھی اپنا کام کیے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری تاریخ کا وہ مرحلہ ایسا نہ تھا کہ اس کا ٹھپّہ بالکل ضائع ہو چکا ہو اور اس کے اثرات ختم ہو چکے ہوں۔ نہیں آج بھی اسلام کے اندر جو حرکت پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری اسی ابتدائی تحریک کے نتیجہ میں پائی جاتی ہے۔

(باقی)

نبوّت کی ضرورت

—— عبدالحمید صدیقی ——

(۸)

اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوتے ایک دوسرا مصنف سوسان سٹلینیگ اپنی ایک مشہور تصنیف "تصورات اور خیالی پیکر" میں رقمطراز ہے:

"انسان کے لیے صرف خوراک ہی ضروری نہیں، وہ صرف مروت اور ہمدردی کا ہی محتاج نہیں، بلکہ اس کے اندر روحانی احساسات و جذبات بھی موجزن ہیں۔ وہ اپنے اندر کچھ تخلیقی صلاحیتیں رکھتا ہے اور اپنے دل میں کچھ آرزوئیں اور تمنائیں بھی پالتا ہے۔ اگر ان غیر مادی قوتوں کی صحیح انداز سے نشوونما نہ کی جائے تو انسان کا مقصدِ تخلیق ہی فوت ہو جاتا ہے اور انسان پھر انسان کہلانے کا مستحق نہیں رہتا . . . . . یہی چیز انسانوں اور حیوانوں کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ میں یہ بات پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ حیوانوں کے اندر روحانی احساسات ناپید . . . ہیں اور انسان انہی کے بل بوتے ہی پر دنیا میں جیتا اور ترقی کرتا ہے[1]۔"

یہی درحقیقت وہ نازک مقام ہے جس میں انسان وحی اور الہام کا محتاج ہے۔ وہ جب اپنے طور پر صرف عقل کی مدد سے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو داخلی زندگی کے تقاضوں کو یکسر بھول جاتا ہے اور اس حقیقت کو پوری طرح نظرانداز کر دیتا ہے کہ اس عالمِ مجاز و محسوسات سے بالا، ہمارے نظامِ کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام بھی موجود ہے جس کی منشا کے مطابق اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنا حیاتِ انسانی کا ایک فطری داعیہ ہے، اور

[1] ایضاً ص ۲۷-۲۸

اس کے برعکس وہ جب داخلی زندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خارجی زندگی کے سارے مطالبات اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اس کے روحانی تجربات خواہ اُس کی ذات کے لیے کتنے ہی قیمتی اور پُرکیف ہوں لیکن وہ ان کی بنیاد پر کوئی ایسا نظامِ فکر و عمل تشکیل نہیں کر سکتا جو خارجی زندگی کے تقاضوں کو پُورا کر سکے۔ اس کے ان تجربات میں داخلیت اور انفرادیت کا رنگ غیر معمولی حد تک نمایاں ہوتا ہے اور اس لیے ان کے اندر معروضی اقدار، جو کسی صالح نظامِ تہذیب کی تعمیر کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، کی تلاش بالکل عبث اور بیکار ہے۔

"روحانی عقلیت"، یا "عقلی روحانیت" یا دوسرے الفاظ میں ایک ایسا روحانی کیف جو معروضی اقدار کا حامل ہو اور اپنے اندر یہ قوت اور صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ انسان کو ایک طرف کائنات کے روحانی اور اخلاقی نظام سے ہم آہنگ کر دے اور دوسری طرف اس بنیاد پر انسانی عقل و خرد کی بھی نہایت کامیابی کے ساتھ رہنمائی کر سکے، انسانی فطرت کا ایک بنیادی مطالبہ ہے اور یہ چیز صرف وحی اور الہام سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے یہاں انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ انسان اپنی ذہنی کاوش سے "روحانی عقلیت" کیوں نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کی تین وجوہات ہیں:-

(۱) انسان کے لیے از خود روحانیت اور عقلیت کے درمیان توازن قائم کرنا بالکل ناممکن ہے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ کسی ایک طرف جھک جائے۔ وہ جب عقلیت کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے گا تو عقلیت کی بنیادوں کو ہی متزلزل کر دے گا اور دوسری طرف جب روحانیت کو عقلی اساس فراہم کرنے کے لیے آگے بڑھے گا تو اس کی کوئی ایسی توجیہ کرے گا جس سے انسان کے روحانی تجربات کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہے گی۔ دورِ جدید کے ماہرین نفسیات انسان کے لطیف روحانی احساسات کی جس انداز سے تذلیل کر رہے ہیں اُسے دیکھ کر اس قسم کی احمقانہ کوششوں کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ روحانیت ایک داخلی تجربہ ہے اور اس وجہ سے اس کی کیفیت کو وہی شخص اچھی طرح جان سکتا ہے جو خود

سب سے پہلے ایک جیتا جاگتا ، فروزاں شعلۂ احساس اپنے قلب کے اندر پیدا کرے ، محض دقتِ نظر اور نظریِ علمیت سے اس کا تجزیہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ۔ لیکن ہمیں عقل کے ان دعویداروں کی جسارت دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کے لطیف تاثرات اپنے سینے میں پائے بغیر وہ ان کی نفسیاتی تحلیل شروع کر دیتے ہیں اور ان کی ایسی توجیہات پیش کرتے ہیں جن سے ان تجربات کی معنویت ہی ختم ہو جاتی ہے ۔ انسان کی ان روحانی کیفیات کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ خدا کے خوف میں بہنے والے آنسوؤں کو اور اپنی سیاہ کاریوں پر گرنے والے اشک ہائے ندامت کو محض غدودوں کی رطوبت قرار دے دیا جاتے ۔ جو عقلیت " وارفتگیٔ شوق " کو قشر کے کیمیاوی تغیرات سے تعبیر کرتی ہے اور عشقِ الٰہی سے پیدا ہونے والے " جذب ، دروں کو " مراکز تلازم خیالات کا اختلال " سمجھتی ہے وہ انسان کے ان اعلیٰ اور ارفع احساسات کے ساتھ کبھی بھی انصاف کا برتاؤ نہیں کر سکتی ۔ وہ ہمیشہ اس ٹوہ میں لگی رہتی ہے کہ کسی طرح علم کے ان روحانی اور سرمدی چشموں کو گدلا قرار دے کر لوگوں کو ان سے برگشتہ کیا جا تے ۔

(ب) اگر بالفرض ہم چند لمحوں کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیں کہ عقلیت کے اندر چند روحانی عناصر کو شامل کیا جا سکتا ہے یا روحانیت میں عقلی اجزا کی آمیزش ممکن ہے تو پھر بھی یہ دقت اپنی جگہ پر موجود رہتی ہے کہ روحانیت اور عقلیت کے اس ملغوبے میں آمیزش کی شرح کیا ہو ۔ یہ مسئلہ بھی بڑا ہی پیچیدہ ہے اور انسان از خود اسے کسی طرح حل نہیں کر سکتا ۔

اس آمیزش میں اگر عقلیت کے اجزا زیادہ طاقتور ہونگے تو وہ روحانی عناصر میں سے اُن کا اصل جوہر نکال کر انہیں بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیں گے اور اس طرح روحانیت عقلیت میں شامل ہونے کے باوجود اثرات اور نتائج کے اعتبار سے بالکل بیکار رہے گی ۔

پھر اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ دو اَن مِل اور بے جوڑ عناصر کی آمیزش بھی کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی ۔ ان دونوں کے اجتماع سے کوئی ایسا روحانی اور فکری نظام معرضِ وجود میں نہیں آسکتا جو قلب و نظر دونوں کے لیے تسکین کا باعث ہو ۔ اس قسم کی جو کوشش کی بھی

جائے گی، فکری انتشار اور قلبی اضطراب پر منتج ہوگی۔

(ج) اس راہ کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ روحانی تجربات خواہ انوار و تجلیات کے اعتبار سے کتنے ہی پرکیف ہوں اور بصیرت افروزی کے لحاظ سے محسوسات سے کہیں زیادہ وزنی' لیکن انہیں اپنی اسی لطیف حالت کے ساتھ خارج میں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان روحانی احساسات میں ایک ایسی گہری ایقانی کیفیت پائی جاتی ہے جس کی صداقت کو منطق اور فلسفہ متزلزل نہیں کر سکتے اور جو لوگ اس نوعیت کے روحانی احساسات سے لذت آشنا ہوتے ہیں اُن کے اندر ایک ایسا ایقان پیدا ہو جاتا ہے جو حسّی تجربات اور منطقی نتائج سے کہیں زیادہ پختہ اور پُرمعنی ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان روحانی کیفیات کی مدد سے خارجی اور مادی زندگی کے لیئے کوئی ایسا لائحۂ عمل تیار کرنا جو دل و دماغ اور عقل و وجدان دونوں کے لیے رُشد و ہدایت کا کام دے بالکل ناممکن ہے۔

تاریخِ انسانی میں وحی و الہام سے بے نیاز ہوکر، اس قسم کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں وہ ہر لحاظ سے ناکام ثابت ہوئیں۔ اس نوعیت کے "مرکبات" میں کبھی کوئی تخلیقی قوت پیدا نہیں ہو سکی۔ ان کے استعمال سے نوعِ بشری کو ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی معاشرے نے روحانیت اور مادیت کے درمیان پیوند لگانے کی سعی کی تو حیاتِ انسانی کے اندر زبردست انتشار اور اختلال رونما ہوا۔ سب سے پہلے تو سوسائٹی میں ایسے لوگ اُبھر کر سامنے آتے جو اپنی خلوتوں میں تو اشراقی اور روحانی تھے لیکن اجتماعی معاملات کو خالص مادہ پرستانہ نظریات کے ساتھ حل کرنے کے لیے کوشاں رہتے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تو پھر سوسائٹی دو مختلف طبقوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک وہ طبقہ جو دنیا اور اُس کے مسائل سے یکسر بے تعلق ہوکر صرف گیان دھیان میں منہمک رہتا اور دوسرا وہ طبقہ جو نیکی' شرافت، خوفِ خدا سے بالکل عاری تھا لیکن اُس نے اجتماعی معاملات کی زمامِ کار سنبھال رکھی تھی۔ اس قسم کی تقسیم سے معاشرے کو جس نوعیت کے نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ اگر ان کی تفصیل درکار ہو تو لیکی کی مشہور کتاب تاریخِ اخلاق یورپ پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اس سے صورتِ حال کا

بآسانی اندازہ ہو سکے گا۔

انسان میں درحقیقت فطری اعتبار سے یہ صلاحیت موجود نہیں کہ وہ از خود روحانیت اور عقلیت کی آمیزش سے کوئی ایسا مرکب تیار کر سکے جو اُس کے وجدان و ایمان اور عقل و فکر دونوں کے معیار پر پورا اترتا ہو۔

یہ صلاحیت خداوند تعالیٰ صرف انبیاء علیہم السلام کو عطا فرماتا ہے کہ وہ روحانی تجربات کو پوری صحت اور صفائی کے ساتھ خارجی زندگی میں منتقل کر کے ایک پاکیزہ تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھیں۔ اُن کے پیش کردہ نظامِ فکر و عمل میں روحانیت اور مادیت کا پیوند نہیں لگا ہوتا۔ بلکہ روحانی نظام ہی اتنا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کا پوری طرح احاطہ کر کے اُن کے اندر وحدت اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح روحانیت اور مادیت کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا اگر اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان نفوسِ قدسیہ نے جب آفاق پر بحث کی تو انفس کے لطیف تاروں کے اندر خود بخود ارتعاش پیدا ہو گیا اور جب انفس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر اُس کے تاثرات پر اظہارِ خیال شروع کیا تو خود عقل پر وجد طاری ہو گیا اور اُس نے پورے جوش اور اعتماد سے ان کی صحت کی تصدیق کی۔

عقلیت اور روحانیت کی دوئی کا مٹا دینا ہی درحقیقت معجزاتِ نبوت میں سے ایک زبردست معجزہ ہے:

انجامِ خرد ہے بے حضوری	ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہائے بے صوت	ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دل در سخنِ محمدی بند	اے پورِ علی ز بوعلی چند!

(اقبالؒ)

رسائل و مسائل

تعدد ازواج پر پابندی

سوال نمبر ۱: میں آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر اسلامی ریاست میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہو تو کیا حکومت اس بنا پر تعدد ازواج پر پابندی عائد کر سکتی ہے؟

اس سوال کی ضرورت میں نے اس لیے محسوس کی ہے کہ میرا اندازہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں تعدد ازواج کی اجازت دی ہے وہاں ہنگامی صورت حال پیش نظر تھی۔ اس زمانے میں سالہا سال کے مسلسل جہاد کے بعد بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں اور بچے بے آسرا اور یتیم رہ گئے تھے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے یہ اجازت دی گئی تھی، تاکہ بیواؤں اور یتیم بچوں کو سوسائٹی میں جذب کیا جا سکے اور ان کی کفالت کی شائستہ صورت پیدا ہو سکے۔

جواب: آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد کا مردوں سے اتنا کم ہونا کہ اس سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو جائے ایک شاذ و نادر واقعہ ہے۔ عموماً تعداد مردوں ہی کی کم ہوتی رہتی ہے عورتوں کی تعداد کم ہونے کے وجوہ وہ نہیں ہیں جو مردوں کی تعداد کم ہونے کے ہیں۔ عورتیں اگر کم ہوں گی تو اس وجہ سے کہ صنف اناث کی پیدائش ہی صنف ذکور سے کم ہو۔ اور ایسا ہونا اول تو شاذ و نادر ہے۔ اور اگر ہو بھی تو عورتوں کی اتنی کم پیدائش نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو اور اسے حل کرنے کے لیے قوانین کی ضرورت پیش آئے۔ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی شادی کے رواج سے یہ مسئلہ خود ہی حل ہو جاتا ہے۔

دوسری بات جو آپ نے لکھی ہے وہ قرآن کے صحیح مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کے کسی دور میں بھی تعدد ازواج ممنوع نہ تھا اور کوئی خاص وقت ایسا نہیں آیا کہ اس ممانعت کو کسی مصلحت کی بنا پر رفع کر کے یہ فعل جائز کیا گیا ہو۔ دراصل تعدد ازواج ہر زمانے میں تمام انبیاء کی شریعتوں میں جائز رہا ہے اور عرب جاہلیت کی سوسائٹی

میں بھی یہ جائز اور رائج تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صحابۂ کرام بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر عامل تھے۔ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ اس آیت کے نزول سے پہلے تعدد ازدواج ناجائز تھا اور اس آیت نے اسے جائز کیا۔ آپ کے علم میں ایسی کوئی آیت ہو تو اس کا حوالہ دیں۔

سوال نمبر ۲:۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ آپ کے جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ میری گزارش صرف اتنی تھی کہ اگر کسی معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہو جائے، تو کیا اس صورت میں حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی عائد کر سکے؟ آپ نے فرمایا ہے کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرا سوال بھی اسی شاذ صورت حال سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت پاکستان میں (مردم شماری کی رُو سے) عورتیں مردوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ اب کیا حکومت کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے کہ جب تک یہ صورت حال قائم رہے، ایک سے زیادہ شادیوں کی ممانعت ہو جائے؟

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تعدد ازدواج کی اجازت کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اس زمانے میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوت حق میں مصروف تھے، تو سالہا سال کے جہاد کی وجہ سے بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا مسئلہ حل کرنا پڑا اور اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دے دی جائے۔ جس مقام پر یہ اجازت دی گئی ہے، اس سے قبل جہاد و قتال ہی کا ذکر آیا ہے۔ اس طرح میں نے (غلط یا صحیح) یہ استنباط کیا ہے کہ یہ اجازت مخصوص حالات کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ استنباط غلط بھی ہے اور جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن کے صحیح مطالعہ پر مبنی نہیں تو اس سے ہٹ کر بھی یہی کچھ سوچا جا سکتا ہے کہ دو دو، تین تین اور چار چار نکاح اسی صورت میں کیے جا سکتے ہیں، جبکہ معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ اگر ان کی تعداد مقابلتہً زیادہ نہ ہو، یا مردوں کے مساوی ہو، تو اس جواز سے فائدہ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: پاکستان کی مردم شماری میں عورتوں کی تعداد کا مردوں سے کم پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہمارے ہاں فی الواقع عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہے۔ بلکہ اس میں ہمارے ہاں کے رسم و رواج کا بڑا دخل ہے جس کی بنا پر لوگ اپنے ہاں کی عورتوں کا اندراج کرانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ تاہم اگر کروڑوں کی آبادی میں چند لاکھ کا فرق ہو بھی تو اس سے کوئی ایسا معاشرتی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا جس کے لیے تعدد ازواج پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ مسئلہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے نکاح ثانی سے حل ہو جاتا ہے اور بالفرض اگر کوئی بہت ہی غیر معمولی کمی واقع ہو جائے تو عارضی طور پر کچھ مدت کے لیے پابندی عائد کرنا بھی جائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس پابندی کا اصل محرک یہی مسئلہ ہو۔ لیکن اس بات کو آخر چھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں تعدد ازواج پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت دراصل اس بنا پر محسوس نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کا اصل محرک یہ مغربی تخیل ہے کہ تعدد ازواج بجائے خود ایک برائی ہے اور از روئے قانون یک زوجی ہی کو رواج دینا مطلوب ہے۔ یہ محرک ہمارے نزدیک سخت قابل اعتراض ہے اور اس کی جڑ کاٹنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کوئی آیت تعدد ازواج کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی ہے۔ تعدد ازواج پہلے سے جائز چلا آ رہا تھا اور سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کے نزول سے پہلے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تین ازواج مطہرات موجود تھیں۔ نیز صحابہ کرام میں بھی بہت سے اصحاب تھے جن کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ سورۂ نساء کی مذکورہ آیت اس جائز فعل کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ اس غرض کے لیے آئی تھی کہ جنگ احد میں بہت سے صحابہ کے شہید ہو جانے اور بہت سے بچوں کے یتیم ہو جانے سے فوری طور پر جو معاشرتی مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اسے حل کرنے کی صورت مسلمانوں کو یہ بتائی گئی کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کر کے ان یتیموں کو اپنی سرپرستی میں لے لو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعدد ازواج صرف ایسے ہی مسائل پیش آنے کی صورت میں جائز ہے۔ آخر تیرہ چودہ سو برس سے ہمارے معاشرے میں یہ طریقہ رائج ہے۔ اس سے پہلے کب یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ تعدد ازواج کی اجازت مخصوص حالات کے ساتھ مشروط ہے؟ یہ طرز فکر تو ہمارے ہاں مغرب کے غلبہ سے پیدا ہوا ہے۔

زکوٰۃ و صدقات کا نظام

سوال :- انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ سے متعلق بعض سوالات کا جواب آپ سے مطلوب ہے - قرآن کہتا ہے : یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو (لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے بچ رہے)

اس پر دو سوال اٹھتے ہیں :-

(۱) ضرورت کی کیا حدود ہیں - ہر شخص اپنی ضروریات کا ایک مختلف تصور رکھتا ہے - کسی کی ضرورت کے دائرہ میں صرف قوت لایموت آتا ہے، کسی کے ہاں آسائشات اور کسی کے تعیشات - پھر اس حکم کا مطلب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ضرورت کے دائرہ یا اس مقدار کے بعد جو بچے وہ خدا کی راہ میں خرچ کرو -

(۲) اگر خدا کی راہ میں تمام بچت خرچ کر دی تو سرمایہ کاری (INVESTMENT) کیسے ہو گی - اس طرح تو سرمایہ ہی نہ ہو گا اور ایک عامل پیدائش ختم ہو جائے گا - ملکی معیشت تباہ ہو جائے گی -

اس کے بعد ایک دو سوالات زکوٰۃ کے بارے میں ہیں - ہمارے پروفیسر صاحب نے زکوٰۃ کا تنقیدی تجزیہ کیا تو مندرجہ ذیل دو نکتے بیان کیے جو درحقیقت اعتراض ہیں - از راہِ کرم ان کا بھی جواب دیں -

پہلا یہ کہ زکوٰۃ متناسب ٹیکس (PROPORTIONAL TAX) ہے متزائد ٹیکس (PROGRESSIVE TEX) نہیں - یعنی شروع میں جہاں سے زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اس سے لے کر ارب پتی تک شرح ایک ہی رہتی ہے - اس طرح کم مالدار لوگوں پر یہ بوجھ زیادہ ہوتا ہے - کیونکہ ۲½ روپے کی قدر زیادہ مالداروں کی بہ نسبت کم مالدار لوگوں کے نزدیک زیادہ ہے - اس طرح یہ ناانصافی ہے جو کہ اسلامی معیشت میں روا رکھی جاتی ہے -

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ اس مال پر فرض ہوتی ہے جو کہ سال کے دوران میں ضرورت سے بچ رہے اور جمع ہو گیا ہو - لیکن اگر ایک آدمی بے دردی سے (LAVISHLY) خرچ کر کے کچھ بھی نہیں بچاتا تو اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہو گی -

جواب :- آپ کے سوالات کے جوابات مختصراً درج ذیل ہیں :-

یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو " میں اسلام کے نظامِ معاشی کا ایک ابتدائی اور بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی جائز کمائی پر حقِ ملکیت حاصل ہے۔ اس سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ شخصی ملکیت سے بالکل دستبردار ہو جائے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اپنی املاک میں تصرف کرے۔ قانوناً اور اخلاقاً اس سے جس انفاق کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ اس مال سے متعلق ہے جو اس کے پاس زائد از ضرورت ہے۔ اسلام کا یہ نقطہ نظر اشتراکیت کے اس نقطہ نظر کے برعکس ہے جس کے مطابق شخصی ملکیت کی نفی کی جاتی ہے اور اسے اجتماعی تحویل میں دے کر فرد کو اس پوزیشن میں رکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے خود اپنی ضروریات پوری کرنے کے بجائے ریاست سے ان کی وصولی کا محتاج اور دست نگر ہو۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ جائز ضروریات کا تعین کیسے کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اموال کی مادی مقادیر کے اعتبار سے ایسا تعین قطعاً محال ہے۔ اسی لیے اسلام نے کچھ کوئی اصول بیان کر کے اور مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کر کے انہیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورت کو خود متعین کرے۔ جن لوگوں نے اس کے برخلاف افراد کی ضروریات کی قانونی حد بندی کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اپنی کوششوں میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

باقی رہا آپ کا یہ خیال کہ زائد از ضرورت خرچ کر دینے کے بعد کچھ باقی نہ بچے گا اور سرمایے کا عامل پیدائش ختم ہو جائے گا تو یہ دو وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں۔ اولاً اس آیت کا لازمی اور قانونی منشا یہ نہیں ہے کہ زائد از ضرورت سارے کا سارا خرچ کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو صدقہ زکوٰۃ اور وراثت وغیرہ سے متعلق بہت سے احکام کا نزول غیر ضروری ہوتا۔ ثانیاً اگر اس آیت سے یہ استنباط کیا بھی جائے کہ ضرورت سے زائد کا انفاق لازم ہے تب بھی راہِ خدا میں دینے کے ساتھ ساتھ ایک شخص اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے اگر کچھ پس انداز کرے تو یہ اس کی ایک ضرورت ہے جس سے اسے جبراً محروم نہیں کیا جا سکتا۔

زکوٰۃ کے متعلق آپ نے اپنے استاد صاحب کے جو اعتراضات نقل کیے ہیں وہ چند در چند غلط فہمیوں اور لاعلمیوں پر مبنی ہیں۔ پہلی غلطی معاشیات کے ان اساتذہ و ماہرین کی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ محض

ایک ناپسندیدہ ٹیکس ہے جسے حکومت زبردستی وصول کرتی ہے اور دینے والا اسے دل پر پتھر رکھ کر دیتا ہے۔ حالانکہ زکوٰۃ اسلام میں نماز کی طرح ایک عبادت ہے جس کے اندر کام کرنے والی روح اور اس پر ابھارنے والا جذبہ ٹیکس سے بالکل مختلف ہے آپ دیکھ لیں کہ ہمارے ہاں صدیوں سے زکوٰۃ وصول کرنے والی اسلامی حکومت موجود نہیں، لیکن دینے والے ہم سے آ آ کر پوچھتے ہیں کہ بتاؤ ہمارے ذمہ کتنی زکوٰۃ ہے کہ ہم اسے ادا کر کے اس فریضے سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس لیے زکوٰۃ کو ٹیکس کے مشابہ قرار دے کر اس کا ٹیکس کے قواعد و نظریات سے موازنہ کرنا بنیادی طور پر صحیح نہیں۔

زکوٰۃ کو ٹیکس سمجھ لینے سے جو دوسری غلطی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ معاشیین اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ٹیکس کا فائدہ بالعموم امیروں اور غریبوں سب کو بلا امتیاز پہنچتا ہے کیونکہ وہ قومی خزانے کا جز بن جاتا ہے اور بعض صورتوں میں امیر اس سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں، لیکن زکوٰۃ ایک ایسا مال ہے جو لیا تو امیر اور متوسط طبقے سے جاتا ہے مگر اس کا استفادہ محض غربا کے لیے مختص ہے۔ یہ صرف نقد سرمایے پر نہیں، بلکہ اموال تجارت پر بھی ہے، زرعی پیداوار پر بھی ہے، مواشی پر بھی ہے۔ معدنیات اور زیورات پر بھی ہے۔ اس کی شرح ہر حال میں ڈھائی فیصد نہیں بلکہ کہیں دس فیصد اور کہیں اس سے زائد ہے۔ زکوٰۃ کا بڑا وسیع اور متنوع نظام ہے جس کا عمل یک طرفہ ہے اور جس میں متزائد ٹیکس کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوتی اگر یہ عمل لگاتار جاری رہے تو نظام معیشت بہت جلد خود بخود متوازن ہو جاتا ہے۔

آپ کے استاد صاحب کا یہ اعتراض بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ زکوٰۃ چونکہ آمدنی کے بجائے بچت پر ہے اس لیے ایک شخص بے دردی سے اپنی دولت کو خرچ کر کے اس سے بچ سکتا ہے۔ اس اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ زکوٰۃ ہر حالت میں بچت پر نہیں ہے۔ سال گزرنے کی شرط تو صرف نقد سرمایے یا سونے چاندی کے معاملے میں ہے۔ زرعی پیداوار پر زکوٰۃ فوراً عائد ہو جاتی ہے، اور ہمارے زرعی ملک میں یہ آمد زکوٰۃ کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی طرح محض بچت پر زکوٰۃ والا اعتراض اموال تجارت، مصنوعات اور ان سے ملتے جلتے دوسرے کاروبار کے خلاف بھی مشکل ہی سے عائد ہو سکتا ہے، کیونکہ کوئی تاجر یا کاروباری اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ محض زکوٰۃ سے بچنے کی خاطر اپنے اموال سال گزرنے سے پہلے اونے پونے داموں پر بیچ دے

اور سرمایے کو بھی ٹھکانے لگا کر خالی ہاتھ بیٹھ رہے ۔

لیکن اس طرح کے اعتراضات کی تہ میں جو بنیادی غلطی کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ معترض حضرات زکوٰۃ کے مجرد اصول کو اسلام کے اجتماعی نظریۂ حیات سے کاٹ کر اسے اپنی توجہ اور عنایت کا مرکز بنا لیتے ہیں اور یہ تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ زکوٰۃ کو اسلام کے پورے معاشی نظام میں اور پھر اس معاشی نظام کو اسلام کے پورے اجتماعی نظام کے فریم میں رکھ کر دیکھیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ستون خواہ اپنی جگہ کتنا ہی مستحکم و مزین کیوں نہ ہو اگر وہ بغیر کسی چھت یا عمارت کے فضا میں استادہ نظر آتا ہو تو وہ عجیب اور بے ڈھنگم معلوم ہوگا۔ بالکل ایسا ہی معاملہ زکوٰۃ اور اس کے خلاف اعتراضات کا ہے ۔ لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ اگر آمدنی کے بجائے بچت پر لگائی جائے گی تو لوگ سارا روپیہ عیاشیوں پر خرچ کر ڈالیں گے ۔ سوال یہ ہے کہ بالفرض محض ڈھائی فیصد زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ایک شخص اپنا سارا روپیہ لٹا دے گا تو آخر کس چیز پر لٹا دے گا؟ زنا کاری، شراب نوشی، رقص و سرود، جوا بازی، ریشم پوشی، سودی سرمایہ کاری، سٹہ، یہ سب اس کے لیے ممنوع ہیں۔ اسی طرح غیر پیداآور اور (UNPRODUCTIVE) اور مفسدانگیز مشاغل کی راہیں قریب قریب مسدود ہیں ۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت یہ بھی کر سکتی ہے کہ اسراف و تبذیر کی راہ میں بالواسطہ طریق پر رکاوٹیں عائد کر دے مثلاً خاص قسم کے سامانِ تعیش کی پیدائش اور درآمد کو روک دے ۔ انسان اپنا پیسہ زیادہ تر انہی لذات و شہوات ہی میں کھپاتا ہے ۔ اس کے بعد اگر وہ کچھ کرے گا، مثلاً مکان بنائے گا، یا فرنیچر خریدے گا تو روپیہ کسی نہ کسی صورت سے گردش میں تو آئے گا، اس کے عوض میں کوئی شے وجود میں تو آئے گی۔ اس سے کچھ لوگوں کو روزگار تو مہیا ہوگا اور روپیہ روک کر رکھنے کی بہ نسبت یہ بہرحال ایک بہتر صورت ہوگی۔ اسلام جو سرمایہ کے خرچ کرنے (SPENDING) کے بجائے اسے جمع کرنے (HOARDING) پر زکوٰۃ عائد کرتا ہے، اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کو جمع کرنے کے بجائے جائز طریق پر خرچ کرنے کی عادت پڑے، اور دولت رکنے اور منجمد ہونے کے بجائے حرکت میں آئے اور نمو پذیر ہو۔

لیکن جیسا کہ اوپر اشارۃً عرض کیا گیا اسلام محض معاشی قوانین و ضوابط ہی کی حد تک ہماری رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام، پورے اسلامی نظام کا ایک جزو ہے جس میں بہت سے اخلاقی، معاشرتی

اور سیاسی عوامل مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ ان فی المال حق سوی الزکوٰۃ (یقیناً مال میں اللہ اور اس کے بندوں کا زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے)۔ وہ ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ اصل کمائی وہ ہے جو ہم نے راہ خدا میں صرف کی۔ وہ نہیں جو ہم نے بچا کر رکھی۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ سود کھانے سے نہیں بلکہ صدقہ دینے سے مال بڑھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حقوق واجبہ سے زائد کسی مالدار سے زبردستی مال تو وصول نہیں کیا لیکن اس نے ایسے مالدار پیدا کیے جنہوں نے اپنا سارا مال فی سبیل اللہ لٹا دیا اور ایسا بھی ہوا کہ سب کچھ دے دینے کے بعد اگر کوئی محتاج نظر آیا تو قرض اٹھا کر اس کی ضرورت پوری کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی محرکات کا انسان کے دوسرے اجتماعی اور اخلاقی محرکات سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ جب تک انسان کے انفرادی اخلاق کو درست نہ کیا جائے اور اس کے گردوپیش کے اجتماعی ماحول کو ایک خاص ظاہری و معنوی سانچے میں نہ ڈھال دیا جائے انسان کا کوئی ایک مسئلہ الگ سے حل نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ معاشی مسئلہ ہو یا زندگی کا کوئی دوسرا مسئلہ۔

عائلی قوانین اور تفویض طلاق

سوال:- سائل کی شادی یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو نئے عائلی قوانین کی رُو سے یونین کونسل کے فارموں پر ہوئی۔ نکاح شرعی طریقہ پر ہوا۔ سائل کے سسرال اور ہمارے تعلقات بہت گہرے تھے اور بہت قریبی رشتہ داری تھی۔ نئے فارم کے چار پرت ہوتے ہیں نکاح کے وقت کوئی شرائط درج نہیں کی گئی تھیں، ماسوائے حق مہر غیر مؤجل کے چونکہ جلدی واپسی تھی اس لیے اس وقت یہ فیصلہ ہوا کہ دولہا اور دلہن اور ان کے گواہان دستخط کر دیں کاغذ بعد میں مکمل ہو گئے اور بھیج دیے جائیں گے۔ نکاح کے وقت لڑکے سے طلاق دینے کا کوئی حق نہیں لیا گیا تھا اور نہ ہی پوچھا گیا تھا اور نہ ہی لڑکے نے اجازت دی تھی۔ نئے فارم کے کالم نمبر ۱۸ میں یہ عبارت درج ہے:-

"آیا شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے اور کن شرائط کے تحت"۔

واضح رہے کہ اس وقت پرت پُر نہیں کیے گئے تھے جبکہ نکاح ہوا تھا) بعد میں کاغذوں میں یہ عبارت درج ہو گئی "شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے"۔ مگر ان میں وہ شرائط درج نہیں تھیں جن کی بنا پر لڑکی کو طلاق دینے کا حق تفویض ہوتا، جیسا کہ فارم میں درج ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ فارم مجھے واپس میرے سسرال کی طرف سے پہنچ گئے۔ لیکن ہم نے انھیں شک نہ ہونے کی بنا پر نہیں پڑھا تھا بلکہ بے پروائی سے لپیٹ کر رکھ دیا۔

شادی کے دس ماہ بعد گھریلو تنازعات کی بنا پر دلہن اپنے میکے چلی گئی جہاں پر دلہن کے والدین نے دلہن کی طرف سے یونین کونسل میں طلاق کی درخواست دے دی اور یونین کونسل نے تین ماہ بعد بغیر کارروائی مکمل ہوئے یک طرفہ طلاق کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

دولہا نے قطعاً طلاق نہیں دی، اور نہ ہی دینا چاہتا ہے۔ اور نہ ہی لڑکے کو طلاق کا سرٹیفکیٹ کونسل کی طرف سے ملا ہے۔ اب لڑکا اور لڑکی اپنا گھر بسانا چاہتے ہیں۔ لیکن لڑکی کے والدین اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ یونین کونسل کی طرف سے جو سرٹیفکیٹ ملا ہے وہ شرعی طلاق ہے۔ اب آپ مندرجہ بالا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بتائیں کہ واقعی طلاق شریعت کی رُو سے ہو چکی ہے یا نہیں؟

جواب: مستفسر کا بیان یہ ہے کہ نکاح کے وقت اس نے حق طلاق بیوی کو تفویض نہیں کیا تھا لیکن اس کے علم و اطلاع کے بغیر یہ بات نکاح کے فارموں میں درج کر دی گئی کہ "شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے"۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو عنداللہ بیوی کی جانب طلاق کا حق منتقل نہیں ہوا اور وہ اس حق کو استعمال نہیں کر سکتی۔ اگر محض کاغذی اندراج اور یونین کونسل کی کارروائی کے بل پر وہ طلاق کو ثابت کرنا چاہتی ہے تو خدا کے ہاں وہ عورت اور اس کے اولیا بھی مجرم ہیں، نیز وہ لوگ بھی سخت گناہ گار ہیں جنھوں نے ایک فارم لے کے طور پر بلا تکلف ہر نکاح نامے میں ایسے امور و مسائل درج کر دیے ہیں جن کے شرعی اور فقہی پہلوؤں پر بالعموم نکاح کے فریقین، بلکہ نکاح خوان بھی اچھی طرح حاوی نہیں ہوتے اور اس بات

کا ہر وقت خدشہ موجود رہتا ہے کہ ان فارموں کو پُر کرنے والا شخص جس طرح چاہے انہیں پُر کرکے زوجین سے دستخط یا نشان انگشت ثبت کرالے، درآنحالیکہ زوجین کو اس بات کا علم واحساس تک نہ ہو کہ آیا وہ مجرد ایجاب وقبول کے علاوہ کچھ مزید قیود وشروط بھی تسلیم کر رہے ہیں یا نہیں، اور اگر کر رہے ہیں تو اس کے نتائج وعواقب کیا ہوں گے؟

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تفویض طلاق سے متعلق سوال کا جواب شوہر کی موجودگی میں اور اس کی اجازت سے لکھا گیا ہے، تب بھی یہ جواب بالکل ناقص اور ادھورا ہے۔ نکاح نامے کا سوال یہ ہے:-

"آیا شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے اور کن شرائط کے تحت"۔

اس سوال کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ یوں ہے:-

"شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے"۔

جس شخص نے بھی یہ جواب تحریر کیا ہے اس کی یہ ناگزیر ذمہ داری تھی کہ وہ اس بات کی تصریح پہلے شوہر سے کراتا اور پھر جواب میں بھی یہ توضیح کرتا کہ حق تفویض کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط ہے یا غیر مشروط ہے اور جس طلاق کا حق دیا جا رہا ہے وہ رجعی ہے یا بائن ہے، ایک ہے یا دو ہیں یا تین ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے بھی جواب میں اس پہلو کی صراحت ضروری تھی اور مطلوبہ فارم کے سوال کا آخری حصہ بھی اس تصریح کا مقتضی تھا۔ اس کے باوجود جواب میں ان چیزوں کی عدم تصریح سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ فارم پُر کرنے والا شخص نکاح وطلاق کے مسائل سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ایک مبہم اور غیر مکمل جواب لکھ دیا ہے جس سے شوہر کے اس الزام کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ عبارت جعلی ہے جو اس کے علم میں لائے بغیر درج کر دی گئی ہے۔

تفویض طلاق کے معاملے میں صحابہ وتابعین کی ایک بڑی تعداد اور امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور متعدد دیگر فقہا کا مسلک یہ ہے کہ اگر مرد نکاح کے وقت کسی مدت یا وقت کا تعین کیے بغیر تفویض کرے تو حق کو عورت صرف اسی مجلسِ نکاح میں استعمال کر سکتی ہے۔ اگر عورت کسی دوسرے کام میں مشغول

ہو جائے یا خاموش ہو کر مجلس سے اُٹھ جائے تو اختیار باطل ہو جائے گا۔ البتہ خاوند اگر تفویض کے وقت یہ اختیار دے کہ اس کی بیوی جب چاہے یا جس وقت چاہے، اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے، تب یہ حق غیر محدود ہے۔ اور عورت اسے ہمیشہ استعمال کر سکتی ہے۔

تفویض طلاق کا حق استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عورت صاف الفاظ میں اپنے آپ کو طلاق دے۔ محض کونسلوں کے سرٹیفکیٹ اس معاملے میں معتبر نہیں ہیں۔ طلاق کی تعداد کا تعین کیے بغیر خاوند نے عام الفاظ میں تفویض طلاق کی ہو تو اس صورت میں عورت اگر اپنے آپ کو ایک یا دو طلاق دے گی یا تعداد کا ذکر نہیں کرے گی تو یہ طلاق عدت کے اندر رجعی ہوگی جس کے بعد رجوع جائز ہوگا اور عدت کے بعد ایسی طلاق بائن یا مغلظ ہو گی جس کے بعد نکاح ثانی جائز ہوگا۔ لیکن عورت نے اگر اپنے اوپر تین طلاق وارد کر لی ہیں تو پھر طلاق کے مغلظ ہونے کا انحصار خاوند کی نیت پر ہے۔ اگر تفویض طلاق کے وقت خاوند کی نیت تین طلاق کی تھی، تو طلاق مغلظ ہو جائے گی، ورنہ نہیں ہو گی۔

تفویض کے معاملہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ حق اگر انعقاد نکاح سے قبل دیا جائے تو غیر معتبر ہے۔ اس حق کے مؤثر اور صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خاوند کی طرف سے دوران ایجاب و قبول یا نکاح ہو جانے کے بعد دیا جائے یا کم از کم حق دیتے وقت نکاح کی جانب نسبت و اضافت ہو، مثلاً خاوند یہ کہے کہ فلاں عورت سے میرا نکاح ہو جانے کی صورت میں اسے حق طلاق حاصل ہو گا۔

حق تفویض کے معاملہ میں اور بھی بہت سی تفصیلات ہیں جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ اصولاً اتنی بات یہاں واضح کر دینا مناسب ہے کہ از روئے قرآن طلاق کا حق اصلاً مرد کو دیا گیا ہے، نہ کہ عورت کو (بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ) جب اس حق کو عورت کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نکاح نامہ میں ایسے سوالات پہلے سے چھاپ کر ہر کس و ناکس کو یہ دعوت دی جاتی ہے اور سمجھایا جاتا ہے کہ وہ شریعت کی قائم کردہ تقدیم و ترتیب کو الٹ دیں اور طلاق کا اختیار مرد سے چھین کر عورت یا کسی کونسل کے ہاتھ میں دیدیں، تو اس کے نتیجے میں اتنی قباحتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جن کا پیشگی تصور بھی محال ہے۔ جن ارباب اختیار نے ایسے قواعد وضع کیے ہیں اور وضع کرنے کے بعد ان کے نفاذ و انطباق کی ذمہ داری کا بوجھ نااہل کندھوں پر ڈال دیا ہے، کاش کہ وہ اس صورت حال پر غور فرمائیں اور اس کا تدارک کریں۔

مطبوعات

THE PILGRIMAGE OF ETERNITY مترجم: جناب شیخ محمود احمد صاحب۔ شائع کردہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۱۸۷۔ قیمت ۱۲ روپے

علامہ اقبال کی یوں تو ساری تصنیفات ہی بڑی بلند پایہ ہیں لیکن ان میں جاوید نامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں تخیل کی بلندی اور ندرت، حکیمانہ طرزِ استدلال، مابعد الطبیعاتی مباحث، شعری محاسن، سوز و گداز، شیرینی اور روانی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کے اہم ترین پہلوؤں کی وضاحت موجود ہے۔ اقبالؒ نے اس لازوال ادبی کارنامہ میں زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات پیش کیے ہیں۔ افلاک کی اس سیر میں شاعر ہمیں مولانا روم، جمال الدین افغانی، سید حلیم پاشا، گوتم بدھ، زرتشت، ٹالسٹائی، نطشے، ملا طاہر غنی کشمیری، شاہ ہمدان، سلطان ٹیپو، غالب، حلاج وغیرہ سے روشناس کراتا ہے۔ یہ حضرت اقبال کے فکر و نگاہ کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ اس کتاب میں علامہ اقبال نے خاص طور پر تقدیر پرستی، قومیت، نام نہاد تصوف، مغربی تہذیب و تمدن، دین اور سیاست کی دوئی، اور اس کے خطرناک نتائج، عقل و عشق کا موازنہ اور عشق کی عقل پر برتری، اسلامی ممالک کی زبوں حالی اور اس کے اسباب، الغرض اسی نوعیت کے بے شمار مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

شیخ محمود احمد صاحب علمی دنیا کی طرف سے ستائش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس قابلِ قدر کتاب کو انگریزی کا جامہ پہنا کر اہلِ مغرب کی فکرِ اقبال تک رسائی ممکن بنا دی ہے۔ یہ ترجمہ بڑا شگفتہ اور رواں ہے اور اس میں انہوں نے نظمِ معرّا سے جس طرح کام لیا ہے اس سے کلامِ اقبال کی روح بھی اس ترجمہ میں کافی حد تک منتقل ہو گئی ہے۔

ہمیں امید ہے جس طرح نکلسن کے ترجمہ اسرار خودی نے مغرب کو اقبال کے افکار سے روشناس کرایا ہے اسی طرح یہ کتاب بھی اقبال کے نظریات کی نشر و اشاعت کا ایک موثر ذریعہ ہوگی۔

کتاب کے شروع میں فاضل مترجم نے تعلیمات اقبال پر ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر فرما دیا ہے۔ کتاب کا معیار طباعت عمدہ ہے۔

گھریلو جھگڑے | جناب ابن فرید صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ بتول اچھرہ۔ لاہور۔ صفحات ۱۲۶ قیمت ۲ روپے ۳۷ پیسے۔

گھر معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ اس کا استحکام معاشرے کا استحکام ہے اور اس کے بگاڑ سے پورے معاشرے کے اندر بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے عائلی زندگی کو کشاکش اور غم و غصہ سے پاک رکھنے کے لیے نہایت ہی پاکیزہ اصول عطا فرمائے ہیں۔ ابن فرید صاحب نے انہیں اصولوں کی روشنی میں انسانی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے گھر کی فضا کو پرسکون بنانے کے لیے چند مؤثر تجویزیں بتائی ہیں۔ اُن کا انداز بیان بڑا دلچسپ، آسان اور حکیمانہ ہے۔

ہم کیسے رہیں | جناب ابن فرید صاحب۔ شائع کردہ ادارہ بتول، اچھرہ۔ لاہور، صفحات ۱۸۱ قیمت دو روپے۔

یہ کتاب بھی "گھریلو جھگڑے" کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں عورت کو اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور اسے یہ بتایا گیا ہے کہ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اسے اپنی کس انداز سے تربیت کرنی چاہیے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کے مزاج میں بردباری اور سنجیدگی ہے لیکن شوہر بہت ہی گرم مزاج اور جذباتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جانا یا ناراض ہو جانا اس کی عادت ہے۔ یہ عادت ظاہر ہے کہ کسی کے لیے بھی نفع بخش نہیں، لیکن آپ کیا کریں کہ آپ کو اس سے سابقہ پڑ ہی گیا ہے۔ آپ کو اس سے نمٹنا ہے۔ یہ موقع [illegible] درگزر اور خوشگواری کا لحاظ کرنے کا ہے۔ آپ یہ فیصلہ کر لیجیے کہ ایسے موقعوں پر آپ ان کو معاف کر دیا کریں گی

پھر آپ دیکھیں گی کہ ساری جھنجلاہٹ یک طرفہ ہو کر رہ جائے گی اور اس میں وہ شدت اور زور باقی نہیں رہے گا جو ہمیشہ ہمیشہ کے تعلقات کو خراب کر دے۔ آپ خیال کرتی ہوں گی کہ شاید یہ شوہر سے دب کر رہنا ہو۔ لیکن نہیں یہ مصالحت کی کامیاب ترین زندگی ہے۔ ہر جذباتی معاملے میں شوہر کو جب یکساں روش کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ خود اپنی حالت پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور ہو گا اور اس کا برتاؤ اس نوعیت کے مقابلے میں یقیناً مختلف ہو گا جبکہ آپ مدمقابل بن کر آئیں گی۔

ساری کتاب اسی قسم کی حکیمانہ باتوں سے بھری ہوئی ہے

فلسفۂ انقلاب | تالیف: جمال عبدالناصر صاحب۔ ترجمہ، دیباچہ و تذکرہ: اسماء رشید ایم، اے۔ شائع کردہ: اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی۔ قیمت تین روپے۔

زیر نظر کتاب "انقلابات" کا کوئی فلسفیانہ تجزیہ نہیں بلکہ ایک آمر کے ذاتی تجربات کی داستان ہے۔ اس میں سیاسی جوڑ توڑ، قتل و غارت کے منصوبے تو بکثرت ملتے ہیں لیکن تفکر کی گہرائی یکسر مفقود ہے۔ یہ درحقیقت قوت و طاقت کے پرستار کے تاثرات ہیں۔ یہ کتاب ہٹلر کی مشہور کتاب "میری جدوجہد" کا چربہ ہے اور اس کا ایک ایک حرف اسی جارحانہ قوم پرستی کی غمازی کرتا ہے جس کی جھلک ہمیں جرمنی کے آمر کی تحریر میں نظر آتی ہے۔

دیباچہ میں مترجمہ نے جمال ناصر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کافی حد تک محل نظر ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ ناصر نے برسر اقتدار آنے کے بعد اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لیا بالکل غلط ہے۔ ناصر صاحب کی خدمات جو کچھ بھی ہوں لیکن انہوں نے اخوان المسلمین جیسی دینی تحریک کو جس ظلم و تشدد کے ساتھ دبایا ہے اور اس کے مخلص کارکنوں پر جس قسم کے مظالم ڈھائے ہیں انہیں انسانیت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ محض خلوص اور قوم اور وطن سے محبت اور اس کی خدمت کا سچا جذبہ کبھی بھی قوموں کو کامرانی کی راہ پر نہیں لگا سکتا۔

مصری ایک آزاد اور طاقتور مصر کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ خواب بڑا مبارک ہے اور خدا

کرے کہ یہ جلد از جلد شرمندۂ تعبیر ہو، لیکن کیا یہ خواب فراعنہ کے بت تعمیر کرنے اور صرف جوش و خروش دکھلانے سے پورا ہو سکتا ہے؟

فاضل مصنف نے فلسفۂ زمان و مکان کے تحت جو کچھ کہا ہے وہ بھی بالکل غلط ہے مثلاً وہ یہ فرماتے ہیں:۔

"آج ہم اس بات پر قادر نہیں کہ دسویں صدی میں لوٹ جائیں، اور وہ لبادے اوڑھ لیں جو ہماری نظروں کو عجیب و غریب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں یا اس دور کے افکار و نظریات میں کھوئے رہیں۔" ص ۱۳۵

یہ نظریہ بڑا گمراہ کن ہے۔ آج اگر دنیائے مغرب روم و یونان کی مادی تہذیب کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم قوم اسلامی نظام کی تجدید کرنے میں ناکام رہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عربیت کا احساس ناصر صاحب کے دل و دماغ میں بالکل شروع ہی سے گہری جڑیں پکڑ چکا تھا اور اسی شعور نے غلط رُخ اختیار کر کے ان کے اندر جارحانہ قوم پرستی کی صورت اختیار کی۔

انہوں نے قومی قوت کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے جن تین سرچشموں کا ذکر کیا ہے اُن میں ایک روحانی رشتوں کی مضبوطی بھی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ قوت و طاقت کے اس اتھاہ اور لازوال خزانے سے ناصر صاحب کہاں تک فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کتاب کا ترجمہ عمدہ اور رواں ہے۔

مولانا مودودی اور تصوف | از مولانا شیخ احمد صاحب۔ ناشر اسلامک بک سنٹر مسجد چوک حیدر آباد دکن

اس فاضلانہ مقالہ میں مولانا شیخ احمد صاحب نے تصوف کی حقیقت بیان کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حقیقی تصوف "تزکیہ نفس" کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مولانا مودودی اس تصوف کے سچے داعی اور مخلص فدائی ہیں۔ اُن کا مشن یہی ہے کہ مسلمان تعلق باللہ سے صحیح طور پر لذت آشنا ہوں۔

(بقیہ اشارات)

مُردنی چھاگئی۔ فسق و فجور، فحاشی اور بے حیائی کی گرم بازاری ہے۔ کوئی انسان اپنی عزت و آبرو کو محفوظ محسوس نہیں کرتا، نوخیز نسلوں کو جس نوعیت کی تعلیم دی جارہی ہے اور ان کی جس انداز سے تربیت ہو رہی ہے اس سے وہ کفر و الحاد کے لیے تو کارآمد اور مفید بن سکتی ہیں لیکن اسلامی تہذیب کی ترویج و اشاعت کے لیے وہ بالکل بیکار ہیں۔ انہیں اسلامی تعلیمات کی بجائے مغربی افکار و نظریات پر یقین اور اعتماد ہے۔ اور انہیں کی برتری کا نقش اُن کے دل و دماغ پر پوری طرح مرتسم ہے۔

ہماری سیاست، ہماری معیشت اور معاشرت، ہمارے ملکی قوانین، ہماری منڈیاں اور دفاتر، ہمارے کارخانے اور بازار الغرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اور قلب و دماغ کا کوئی گوشہ بھی خالقِ کائنات کی بندگی اور اطاعت کا منظر پیش نہیں کرتا بلکہ بغاوت اور سرکشی کے بھیانک سے بھیانک مناظر سامنے لاتا ہے۔

اس تشویشناک صورتِ حال کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ہم پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہمارے اندر اسے بدلنے کے لیے کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ہم گمراہی اور ضلالت کی راہ فلاح و کامرانی کی راہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہی وہ عارضہ تھا جس نے گزشتہ قوموں کو برباد کیا اور یہی عارضہ آج ہمیں لاحق ہو گیا ہے۔ ہم چوٹوں پر چوٹیں سہتے ہیں لیکن ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ازل ہمارے کان میں مسلسل چیخ رہی ہے لیکن وہ ہمارے مُردہ احساسات کو جگا نہیں سکتی! انقلاباتِ زمانہ ہمیں برابر جھنجھوڑ رہے ہیں لیکن ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ خدا کے پیغام اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات سے ہم نے صرفِ نظر کر لیا ہے۔ حوادثات آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن ہم اُن سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات، حوادث و تغیرات اور گزشتہ قوموں کی داستانیں، یہیں ہی تو ذرائع ہیں جن سے قومیں ہدایت پاتی ہیں لیکن ہم ان میں سے کسی طرف بھی

متوجہ نہیں ہوتے۔ نہ ہم اللہ کے کلام سے مستفید ہوتے ہیں، اور نہ دنیا کے گزرے ہوئے واقعات سے عبرت پکڑتے ہیں۔ ہم ٹھیک انہیں لوگوں کے قدموں پر جا رہے ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا ہے:

مَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ۔ (۶:۴)

اللہ کی نشانیوں سے کوئی نشانی بھی ایسی نہ آئی جس کو دیکھ کر انہوں نے عبرت پکڑی ہو اور غفلت اور سرکشی سے باز آگئے ہو۔

أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۱۶:۲۱)

یہ زندگی کی آبادی نہیں بلکہ مردوں کی بستی ہے وہ اٹھنے اور اٹھائے جانے کی گھڑی سے بالکل غافل پڑے ہیں۔

جو قادرِ مطلق ذات نوح علیہ السلام کی قوم کو بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے ہلاک کر سکتی ہے، قوم عاد اور ثمود کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے برباد کر سکتی ہے۔ وہ آج بھی نافرمانوں کو اُن کی نافرمانیوں کا مزہ چکھانے پر پوری پوری قدرت اور طاقت رکھتی ہے۔ کیا گزشتہ دو جنگوں کی ہولناکیاں اور ان کے لائے ہوئے مصائب ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں۔ کیا قحط، سیلاب، بیماریوں کی کثرت اور امن و سکون کا فقدان ہمارے احساسات میں حرکت پیدا نہیں کر سکتا۔ آخر ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کہیں ہم پر وہ حالتِ سکر تو طاری نہیں ہوئی جو ہلاکت اور بربادی سے پہلے قوموں پر طاری کر دی جاتی ہے۔

وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا۔

اور ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں کہ فکر کی آنکھ بیکار ہو گئی ہے اور اُن کے کان بہرے ہو گئے ہیں۔

یہ کیفیت درحقیقت تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کیفیت میں قومیں زیادہ دیر تک

معلق نہیں رکھی جاتیں۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اب ایک گروہ کو مٹا کر ایک دوسرے گروہ کو دنیا میں سربلند کیا جا رہا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ (۶-۷)

اور تمہارا پروردگار بے پروا اور فیاض ہے اگر وہ چاہے گا تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ دیگا اور تمہارے بعد کسی دوسری جماعت کو کھڑا کردیگا جس طرح کہ خود تم کو دوسروں میں سے اُس نے منتخب کیا تھا۔
